معارف

جولائی ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ر روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ر روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ر روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ر روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ر روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ر روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۰ | ماہ شوال المکرم ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۱۷ء | عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ابھی اس کی عمر کل پندرہ سال تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اپنے گاؤں سے دور میوات میں زیر تعلیم تھا۔ وہ صرف رمضان کی چھٹیوں میں گھر آتا تھا جہاں اس کا بڑا انتظار رہتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ کھیل کود میں بھی حصہ لیتا تھا لیکن اس کے اطوار اور انداز سب سے الگ تھے۔ وہ نہ لڑائی جھگڑے میں حصہ لیتا اور نہ کوئی گالی یا نا ملائم لفظ اس کی زبان پر آتا۔ وہ انہی میں سے تھا لیکن ان سے الگ بھی تھا اور شاید اسی لیے وہ سب کو بہت عزیز تھا۔ وہ ایک سنجیدہ اور محنتی طالب علم تھا۔ وہ بہت سویرے اٹھ جاتا تھا اور اپنی تعلیمی مصروفیات میں مشغول ہو جاتا۔ ابھی اسی سال اس نے حفظ قرآن کی تکمیل کی تھی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ آیندہ زندگی کے تعلق سے اس کے بھی کچھ خواب اور کچھ منصوبے رہے ہوں گے۔ اس کے والدین، اعزہ اور گاؤں والوں کی بھی بہت سی توقعات اس سے وابستہ رہی ہوں گی۔ اس سال اس نے تراویح میں قرآن سنایا تھا۔ ختم قرآن کے دوسرے دن وہ اپنے بعض دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ عید کے کپڑے لینے دہلی گیا۔ واپسی کا سفر اس کا آخری سفر ثابت ہوا۔ نام نہاد گئو رکشک دہشت گردوں نے گائے کا گوشت کھانے کے الزام میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ ایک گھر کا چراغ بجھ گیا، ایک قیمتی جان ضائع ہوگئی اور ایک اچھے انسان سے معاشرہ محروم ہو گیا۔ جو سلسلہ اخلاق محمد سے شروع ہوا تھا وہ دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔ حافظ جنید خاں اور اس طرح کے دوسرے مظلوموں کا قتل ایک عام جرم نہیں ہے بلکہ یہ کھلی ہوئی دہشت گردی ہے، یہ انسانیت کا قتل ہے، یہ ان اقدار کا قتل ہے جن کے لیے ہندوستان جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ جن حالات میں جنید کا قتل ہوا وہ بے شمار لوگوں کو روزانہ پیش آتے ہیں۔ اس دہشت گردی کا اگر پوری سختی کے ساتھ مداوا نہیں کیا گیا اور اس کے خلاف حکومت پوری طرح بروئے کار نہیں آتی تو کسی کے بھی ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دنیا بھر سے دہشت گردی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر میں پنپنے والی دہشت گردی کی طرف بھی توجہ دیں ورنہ ملک کے اتحاد و سالمیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

کسی قدر اطمینان کی بات یہ ہے کہ نہایت تیزی سے بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال کے باوجود اس ملک میں ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جن کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ حافظ جنید خاں کے قتل کے بعد

سماج کے مختلف طبقات کی طرف سے جو ردِعمل سامنے آیا وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ اس واقعہ پر انفرادی سطح پر نمایندہ شخصیات کے غم وغصہ کے اظہار کے علاوہ ۲۷؍ جون کو ملک کے طول وعرض میں مختلف شہروں میں جس پیمانہ پر اس واقعہ کے خلاف مظاہرے ہوئے اس سے اس شدید غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہے جو ملک کے باشعور اور حسّاس شہری اس سلسلہ میں محسوس کر رہے ہیں۔ دہلی میں جنتر منتر پر ایک بڑا مظاہرہ جس میں سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ ساتھ دانشوروں اور سیاسی پارٹیوں کے نمایندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ بڑے پیمانے پر منعقد ہونے والے یہ مظاہرے کسی سیاسی پارٹی کے جھنڈے تلے نہیں کیے گئے تھے بلکہ ملک کے باشعور باشندوں نے اس کا اہتمام کیا اور اس کی تنظیم کا کام سوشل میڈیا کے ذریعہ انجام پایا۔ شرکاء نے جو بینر اٹھا رکھے تھے ان پر تحریر تھا Not in my name اور Stop cow terrorism۔ وزیر اعظم نے بھی، جن کو بین الاقوامی مصروفیات کی وجہ سے کم ہی اس بات کی فرصت ملتی ہے کہ ان چھوٹے موٹے معاملات کی طرف توجہ دیں، ان مظاہروں کے دباؤ میں ایک بیان جاری کیا اور کہا کہ یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان دباؤ میں دیا گیا اور اس کے پیچھے کسی مضبوط عملی اقدام کا منصوبہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بیان کے اگلے ہی دن جھارکھنڈ میں یہی حادثہ پھر پیش آیا اور ایک اور قیمتی جان نفرت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی۔ اس صورت حال میں سماج کے باشعور افراد کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔

ان مایوس کن حالات میں گذشتہ دنوں بعض اچھی خبریں بھی آئیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل پوری خود اعتمادی سے ملت کو درپیش حالات سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کر رہی ہے۔ CBSE کی طرح ICSE بھی امتحانات کا ایک آل انڈیا بورڈ ہے۔ اس کے دسویں کلاس کے امتحانات کے نتائج ابھی جلد ہی آئے ہیں۔ اس میں پونا کی ایک مسلمان بچی نے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ کئی صوبائی بورڈس کے امتحانات میں مسلمان بچوں اور بچیوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ گذشتہ دنوں جب یونین پبلک سروس کمیشن نے انڈین سول سروس کے نتائج شائع کیے تو امید کی ایک کرن پھر نظر آئی۔ ملک کی سب سے باوقار سروس میں مسلمان امیدواروں نے نہایت اعلیٰ درجہ کی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے اور ملک کی آزادی کے بعد سب سے بڑی تعداد میں کامیابی حاصل کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اس سال 1,099 کامیاب ہونے والے امیدواروں میں ۵۱ مسلمان ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں جب سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی تھی سول سروس میں مسلمانوں کی نمایندگی کا تناسب صرف 3% تھا۔ اس سال یہ تناسب 4.5% ہے۔ سول سروس میں بہتر کارکردگی کا رجحان گذشتہ چند برسوں سے

نظر آرہا تھا۔ ۲۰۱۳ء میں ۳۰، ۲۰۱۴ء میں ۳۴ اور ۲۰۱۶ء میں ۳۶ مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے۔اس سال یہ تعداد بڑھ کر ۵۱ ہوگئی جواب تک کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ملک میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد اب بھی بہت کم ہے اور مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے متناسب نمایندگی حاصل کرنے کے لیے ابھی لمبی مسافت طے کرنی ہے۔سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں مسلمانوں کی آبادی مجموعی آبادی کی 13.4% ہے۔اگر اس تناسب کو صحیح باور کرلیا جائے تو بھی سول سروس میں ان کا حصہ ۱۷۰ سے ۱۸۰ تک بنتا ہے۔ابھی تو یہ منزل دور ہے لیکن یہ نتائج اس حقیقت کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں ملک کے انتظامی ڈھانچہ میں اپنی حیثیت بحال کرنے کا احساس بیدار ہو چکا ہے اور وہ اس کے لیے ہر ممکن جدوجہد کررہی ہے اور اس کے مثبت نتائج بھی سامنے آنا شروع ہوگئے ہیں۔اس سال کے نتائج کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ۱۰۰ ٹاپ پوزیشن حاصل کرنے والوں میں ۱۰ فیصد مسلمان ہیں۔یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ کامیاب ہونے والے مسلمان امیدواروں میں ۱۴ کا تعلق کشمیر سے ہے۔ ایک کشمیری طالب علم بلال محمد دین بھٹ نے دسویں پوزیشن حاصل کی ہے اور بھرت پور کے عبدالجبار اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے پہلے میواتی مسلمان ہیں۔

سول سروس اور دوسری اہم ملازمتوں میں مسلم نمایندگی میں غیر معمولی حد تک کمی کے اسباب مختلف اور متنوع ہیں۔ان میں تاریخی، سیاسی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی اسباب وعوامل شامل ہیں۔ان کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔مسلمانوں کو موجودہ نظام سے شکایت بھی ہے جو غالباً یکسر غلط نہیں ہے۔ان سب کے باوجود یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ مسلمان ان امتحانات میں اتنی بڑی تعداد میں شریک نہیں ہوتے جتنا ملک میں ان کی آبادی کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔اس سال کے نتائج سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ تمام تر مشکلات اور موانع کے باوجود یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے اور ہماری نئی نسل کے اندر اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔اگر مسلمان طلبہ پوری دلجمعی، حوصلہ اور لگن سے ان امتحانات میں شرکت کریں تو یقیناً کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ شعوری طور پر اس کے لیے کوشش کی جائے اور ایسی فضا بنائی جائے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان ان امتحانات میں شرکت کریں اور ملک کے انتظامی ڈھانچہ میں اپنی حصہ داری کو یقینی بنائیں۔ملک کا نظم ونسق دراصل یہی لوگ چلاتے ہیں اور اس میں مسلمانوں کی بھرپور حصہ داری ضروری ہے۔

مقالات

انتقال خون سے متعلق ایک فقہی فیصلہ کا تحلیلی مطالعہ

ڈاکٹر محمد امتیاز حسین

اللہ رب العزت نے انسان کو ہزار انعامات و اکرامات کے ساتھ زندگی عطا فرمائی تو ساتھ ساتھ اس کی سلامتی و حفاظت کو بھی اہمیت دی۔ اسی لیے ایسی چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا جو انسانی زندگی کے تحفظ میں مانع ہوں یا ان سے ہلاکت و بربادی کا شبہ ہو۔ حیات انسانی کی بقاء اور تحفظ کا ایک ذریعہ علاج و معالجہ بھی ہے خود اللہ رب العزت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علاج و معالجہ کی ترغیب دی ہے۔ ہر زمانے میں علاج کے طریقے مختلف رہے ہیں، عہد رفتہ میں عام طور پر نباتات اور جمادات علاج کا ذریعہ تھیں لیکن انسانی زندگی ہر دم رواں دواں ہے، ہر عہد جدید اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتا ہے عصر حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ہر گوشے اور ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ہر علم و فن میں نئے مسائل پیدا ہوئے اور ان کے حل کے لیے تحقیق و تفتیش کے نئے میدان کھلے ہیں، باقی علوم و فنون کی طرح علم طب و جراحت نے ترقی کی اور علاج و معالجہ میں بہت سی نئی صورتیں پیدا کر دی ہیں ان سے جہاں طبی فوائد حاصل ہوئے ہیں وہاں بہت سے حلال و حرام سے متعلقہ شرعی مسائل پیدا ہوئے ہیں جدید شرعی مسائل میں سے ایک انتقال خون بھی ہے۔

انتقال خون کا مفہوم: انتقال عربی زبان کا لفظ ہے اور باب افتعال کا مصدر ہے اس کا مادہ مجرد ن۔ق۔ل ہے اسی لیے عربی زبان میں انتقال خون کی بجائے نقل دم کا لفظ مستعمل ہے انتقال خون کی تفہیم کے لیے نقل اور دم کے معنی الگ الگ جاننا ضروری ہیں جو درج ذیل ہیں:

نقل کا معنی: صحاح میں نقل کا معنی یوں ہے:

---

drimtiaz49@gmail.com

نقل الشئ من مکان الی مکان الآخر۔(۱) کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔

دم کا معنی: اہل لغت نے دم کے اصل مادہ میں دو قول نقل کیے ہیں سیبویہ (۲) کے نزدیک یہ دمی سے مشتق ہے جب کہ مبرد کے نزدیک دمو (۳) سے مشتق ہے دم کی اصل دمی ہو یا دمو، معنی ایک ہی ہے:

الدم سائل احمر یسری فی عروق الانسان وھو عماد الحیوۃ۔(۴) خون انسان کی رگوں میں گردش کرنے والا ایک سرخ رنگ کا سیال مادہ ہے اور اسی سیال مادے پر انسانی زندگی کا مدار ہے۔

نقل اور دم کے لغوی معنی سے ظاہر ہوا کہ انتقال خون کا مطلب خون کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرنا ہے خواہ وہ کسی بھی ذریعہ سے ہو۔

مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ کا فیصلہ: مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ نے اپنے گیارہویں اجلاس منعقدہ رجب ۱۴۰۹ھ بہ مطابق فروری ۱۹۸۹ء میں انتقال خون کے جواز کا فتوی دیا جو درج ذیل ہے:

الحکم ھو الجواز بشروط: ان تتحقق الضرورۃ بان خیف علیٰ حیوۃ الانسان ولیس ماینقذہ الا ھذا العمل وان تکون نسبۃ نجاح ھذا العلاج عالیۃ وان یکون برضاء الانسان المأخوذ منه وألا یؤثر علیٰ حیاته او علیٰ صحته تأثیراً شدیداً ویمکن التأکد من ذلک برأی الطبیب الماھر العدل (۵)

مجمع الفقہ الاسلامی نے ایک انسان کے خون کو دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کرنے کو چند شروط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ جب ضرورت متحقق ہو بایں طور کہ کسی انسان کی جان جانے کا خطرہ یا ڈر ہو اور اس عمل کے سوا جان بچانے کا اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اس علاج کی کامیابی کا گمان غالب ہو۔ جس شخص کا خون لیا جا رہا ہو وہ خون دینے پہ راضی ہو، خون دینے کی وجہ سے خون دینے والے کی زندگی متاثر نہ ہوتی ہو یا اس کی صحت کے شدید متاثر ہونے کا ڈر نہ ہو اس بات کا اندازہ کسی ماہر حاذق عادل طبیب کی رائے سے لگایا گیا ہو۔

قرآن کریم: ہماری زندگی میں خون کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ زندگی کا دارومدار جن خلیات پر ہے ان کا وجود دوران خون پر موقوف ہے اس لیے کہ خون جسم کے تمام خلیوں کو غذا اور آکسیجن مہیا کرتا ہے اور نقصان دہ فضلات کو چوس کر جسم سے خارج کرتا ہے طب اپنی تمام تر حیران کن اور تیز رفتار ترقی کے باوجود اس عطیہ الٰہی کا بدل ایجاد کرنے سے عاجز ہے لہٰذا کوئی چیز بھی انسانی خون کا بدل نہیں بن سکتی اللہ تعالیٰ نے خون کی دو قسمیں بنائی ہیں ایک قسم وہ ہے جو دوران خون اپنا کردار ادا کرتا ہے دوسرا خون وہ ہے جو جگر تلی وغیرہ میں جمع ہوتا ہے اور جب کبھی جسم میں کسی حادثے کے باعث خون کی کمی ہو جائے تو یہ اس کمی کی تلافی کر سکتا ہے۔خون چونکہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں لہٰذا جب کسی بیماری یا حادثہ کی صورت میں کسی انسان کے جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم رہ جائے کہ جو اس کی نبض کو حرکت میں رکھنے سے قاصر ہو تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے ازمنہ قدیم میں ایسے شخص کو موت سے بچانا ایک ناممکن سی بات تھی کیونکہ اس دور کے اطباء کے پاس خون کی کمی کی تلافی کا کوئی متبادل راستہ موجود نہ تھا لیکن دور حاضر میں سائنسی ترقی کی بدولت جدید ٹیکنالوجی نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ ایک انسان کا خون انجکشن یا کسی اور آلہ کی مدد سے نکال لیا جائے اور انجکشن وغیرہ ہی کے ذریعہ کسی دوسرے کے جسم میں منتقل کر دیا جائے اس طریقہ پر عمل کرنے سے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ایسے مریضوں کی جان بچانا کافی حد تک ممکن ہو گیا ہے چنانچہ دور حاضر کے طبی ادارے اور ڈاکٹر وغیرہ ضرورت کے وقت اس طریقہ پر عمل کرتے ہوئے کسی صحیح اور تندرست آدمی کا خون ایسے بیمار شخص کے جسم میں منتقل کر دیتے ہیں جس کے جسم میں حادثے یا بیماری کی وجہ سے خون کی کمی واقع ہو چکی ہو یہ طریقۂ علاج اس وقت دنیا بھر میں متعارف ہے اور ہر ملک کے ڈاکٹر اس سے استفادہ کر رہے ہیں ہمارے پیش نظر اس وقت یہ مسئلہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں اس طریقۂ علاج یعنی علاج بہ نقل الدم کی کس حد تک گنجائش ہے اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

علماء کی ایک جماعت (۶) کا خیال ہے کہ آدمی اور ماکول اللحم جانور کا خون پاک ہے جب کہ احناف (۷) مالکیہ (۸) شوافع (۹) حنابلہ (۱۰) اور ابن تیمیہ (۱۱) کے نزدیک سیال خون حرام اور نجس ہے چاہے وہ آدمی یا ماکول اللحم جانور ہی کا کیوں نہ ہو لیکن جب خون چڑھانے کے سوا کوئی اور طریقہ علاج نہ ہو مثلاً کسی حادثہ، گولی لگنے یا آپریشن کی وجہ سے اس قدر خون بہ جائے کہ بغیر خون

چڑھائے مریض کا جانبر ہونا مشکل ہو تو ایسی ضرورت اور اضطرار کے موقع پر مریض کو خون چڑھانا جائز ہے یا کسی کو بلڈ کینسر (خون کا سرطان) ہو جس میں ایک معینہ عرصہ کے بعد ہر مرتبہ جسم کا پورا خون تبدیل کرنا پڑتا ہے ورنہ مریض مرجاتا ہے مذکورہ بالا سب صورتوں میں انتقال خون کے ذریعہ علاج ضرورت کا درجہ اختیار کر جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن مجید میں خون کا حرام ہونا بیان کیا ہے وہاں ضرورت کے وقت اس کے استعمال کا جواز بھی بیان کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَلا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔(۱۲)

بے شک اس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیکن جو مجبور ہو جائے درآں حالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

قُل لاَّ أَجِدُ فِيْ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلاَّ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَماً مَّسْفُوحاً أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيم (۱۳)

(آپ فرمائیں میں نہیں پاتا (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف سے کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے مگر یہ کہ مردار ہو یا (رگوں کا) بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ وہ سخت گندہ ہے یا جو نافرمانی کا باعث ہو (یعنی) وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بلند کیا جائے غیر خدا کا نام پھر جو شخص لاچار ہو جائے نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو (حد ضرورت سے) تو بے شک آپ کا رب بہت بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے)۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلاَّ مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ۔ (۱۴)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لیے جو اس نے حرام کیا ہے تم پر مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو اس کی طرف۔

وجہ استدلال: یہ اوران جیسی دوسری آیات جہاں خون اور دیگر اشیا کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں وہاں ضرورت کے وقت اس کے ساتھ علاج کرنے کے جواز پر بھی دلالت کرتی ہیں پس اس بات پر فقہاء کا اجماع ہے(۱۵) کہ حالت اضطرار میں مردار کا گوشت، شراب اور دیگر اشیاء جن کی حرمت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہوا ہے ان سے انتفاع جائز ہے اسی طرح حالت اضطراب میں جب خون کے بغیر علاج ممکن نہ ہو تو علاج بالدم بھی جائز ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۱۶)　　اورنہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی۔

وجہ استدلال: اس آیت سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ آیت مریض سے بیماری اور تنگی کو اٹھانے پر دلالت کرتی ہے جس طرح فقہاء نے وضاحت کی ہے(۱۷) اور علاج کا ہر وہ راستہ جس سے مرض دور ہو سکے اسلام نے اس کو مشروع قرار دیا ہے چاہے وہ مریض سے مرض کا دور کرنا خون کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو اور مریض سے مرض کو دور کرکے اس کے نفس یعنی اس کی جان کو محفوظ کرنا مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے۔لہٰذا اگر مریض کو خون لگانا اشد ضروری ہو تو مقاصد شریعت پر عمل کرتے اس کو خون لگانا جائز ہوگا، کیونکہ شریعت کا مقصد تنگی نہیں بلکہ آسانی ہے۔

قرآن مجید نے ان مسلمانوں کی مدح کی جو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ایثار اور تعاون کرتے ہیں جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (۱۸)　　اور وہ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ تنگی میں ہی کیوں نہ ہوں۔

وجہ استدلال: اس آیت بینہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام نے اپنے مکلفین کو صرف یہ ترغیب نہیں دی کہ مسلمان بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت کے برابر کا درجہ دینا ہے بلکہ اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا ہے لہٰذا جب ایک مسلمان اپنی ضرورت اور کھانے پینے کی اشیاء کو دوسرے مسلمان کے لیے قربان کر دیتا ہے تو جب اس کی جان خطرے میں ہو تو اسی خوراک سے بننے والا خون اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے پیش کر دینا ایثار کا اعلیٰ ترین عملی مظاہرہ ہوگا۔

احادیث مبارکہ: خون لگوانا چونکہ جدید طریقہ علاج ہے اور اس کا واضح حکم احادیث میں موجود

نہیں ہے لیکن خون کے ذریعہ دوا کی واضح شکل احادیث میں موجود ہے جس طرح کہ مندرجہ ذیل احادیث پاک سے واضح ہوتا ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم احتجم فی راسه (۱۹)	حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سر میں پچھنے لگوائے۔
انّ جابر بن عبد اللّٰہ عاد المقنع ثم قال لا ابرح حتی تحتجم فانّی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم یقول انّ فیه شفاء۔(۲۰)	حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقنع کی عیادت کی۔ پھر فرمایا: میں نہیں جاوں گا حتی کہ تو پچھنے لگوائے کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اس میں شفاء ہے۔

وجہ استدلال: درج بالا احادیث اور اس جیسی دوسری احادیث مبارکہ (۲۱) سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجامت اور فصد کو بہتر اور مشروع قرار دیا اور خود بھی اس طریقۂ علاج کو اختیار فرمایا چنانچہ تمام فقہاء (۲۲) حجامت کے ذریعے تداوی کے جواز پر متفق ہیں پس اگر تداوی بالفصد والحجامت جائز ہے تو تداوی بنقل الدم بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا کیونکہ دونوں میں قوی تعلق ہے حجامت خون نکالنے اور بہانے کا عمل ہے اور نقل الدم خون کو ایک جسم سے نکال کر دوسرے جسم میں داخل کرنے کا عمل ہے، اگر بطور دوا اور علاج کسی کے جسم سے خون نکال کر بہانا جائز ہے تو اسی علت کی بنیاد پر کسی کے جسم میں خون داخل کرنا بھی جائز ہوگا اور اس میں کوئی شک نہیں خون کو ایسے آدمی کے جسم میں نقل کر دینا جس کو اپنی جان بچانے کے لیے خون کی سخت ضرورت ہو، کسی کے جسم سے خون نکال کر بہا دینے سے زیادہ مفید عمل ہے۔

اقوال فقہاء: فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

یجوز للعلیل شرب الدم والبول و اکل المیتة للتداوی اذا اخبره طبیب مسلم ان شفائه فیه ولم یجد	بیمار کو از راہ علاج مردار کھلانا خون اور پیشاب پلانا جائز ہے بشرطیکہ مسلم طبیب اسے اطلاع دے کہ اسی میں شفاء ہے اور وہ کوئی دوسری مباح چیز نہ

من المباح مایقوم مقامه۔(۲۳)　　پائے جو اس کے قائم مقام ہو۔

فقہاء کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان طبیب اس بات کی خبر دے رہا ہو کہ کسی بیماری کا علاج حرام چیز سے یقینی ہے اور اس کوئی متبادل حل موجود نہ ہو تو ضرورت کے تحت حرام چیز کا استعمال جائز ہوگا۔ جب خون پلانے سے تداوی جائز ہے تو کسی اور کا خون لگانے سے بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔ امام جصاص حالت اضطرار میں خون کے پینے کو مباح جانتے ہوئے اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

من اضطر الی اکل المیتة و الدم و لحم الخنزیر فلم یاکل حتّٰی مات دخل النار الّا یعفوا اللہ عنه۔(۲۴)　　اور جس کو مجبور کیا گیا کہ وہ مردار کا گوشت کھائے، خون پیے یا خنزیر کا گوشت کھائے تو اس نے نہ کھایا یہاں تک کہ وہ مرگیا تو جب تک اسے اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے وہ جہنمی ہے۔

امام جصاص کی اس رائے کے مطابق اگر ضرورت کے وقت خون پینا جائز ہے تو دوا کے لیے خون کو لگوانا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں ہے:　　و لا باس بان یسعط الرجل بلبن المراۃ و یشربه للدواء۔(۲۵)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آدمی دوا کے طور پر عورت کا دودھ اپنی ناک میں ڈالے یا پیے

خون اگرچہ جزء انسانی ہے لیکن اس کے ادخال اور انتقال کے لیے کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں لہٰذا اس کی مثال انسانی دودھ کی طرح ہوگی۔ مذکورہ بالا عبارت میں فقہاء نے علاج کے طور پر اس کا نکالنا اور پھر اس کے پینے یا ڈالنے کو جائز قرار دیا ہے تو خون کا انتقال اور ادخال بھی جائز ہوگا، جزء انسانی ہونے کی بنیاد پر خون کو دودھ پر قیاس بھی کیا جا سکتا ہے اور ان میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ یہ جسم انسانی سے اخراج کے بعد جلد اپنی کمی پوری بھی کر لیتے ہیں۔

قواعد فقہیہ:　　زمانہ قدیم میں چونکہ انسانی وسائل اور سہولیات محدود تھیں عصر حاضر کی سائنسی ترقی کے باعث نئے مسائل اس وقت درپیش نہ تھے اس وجہ سے دیگر جدید مسائل کی طرح انتقال خون کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں اور نہ ہی وسیع فقہی سرمایہ

میں اس قسم کے مسائل سے متعلق شافی نصوص ملتی ہیں البتہ اس پر دلالت کرنے والے قواعد فقہیہ درج ذیل ہیں:

الضرورات تبیح المحظورات ۔(۲۶) ضرورتیں ممنوع چیزوں کو بھی جائز بنا دیتی ہیں۔

خون جزء انسانی ہے جب اس کو بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس اور ناپاک ہے۔لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے انسان میں داخل کرنا جائز نہیں ہوگا لیکن جب ضرورت ہو کہ خون لگانے کے بغیر انسان کی جان خطرے میں ہو یا ڈر ہو کہ خون لگانے کے علاوہ جان بچانے کا کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو خون کا لگانا ضرورت کا درجہ حاصل کر لے گا اور مندرجہ بالا قاعدہ کی روشنی میں ضرورت کے وقت ممنوع چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں۔لیکن خون کا استعمال صرف ضرورت کی مقدار جائز ہوگا کیوں کہ شرعی قاعدہ ہے۔

والضرورات تقدر بقدرها۔ (۲۷) ضرورتیں ضرورت کی مقدار جائز ہوتی ہیں۔

اس قاعدہ کی رو سے ضرورت کے وقت محض اسقدر ہی ممنوعہ چیز کا استعمال جائز ہوگا جس کے ذریعہ جان بچائی جا سکتی ہے لہٰذا علیٰ سبیل التلذذ یعنی محض لطف اندوزی کے لیے حرام چیز کا استعمال جائز نہ ہوگا۔اسی لیے جتنا خون ضرورت کے درجہ میں ہوگا اتنا جائز ہوگا۔

الضرر یزال (۲۸) ضرر کو زائل کیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی رو سے انسان کو جہاں کہیں نقصان کا اندیشہ ہو اس کو نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔اللہ رب العزت نے انسانی زندگی کے تحفظ کا حکم دیا اور انسانی جان کا ضیاع سب سے بڑا نقصان ہے اور اس نقصان سے کسی جان کو بچانا سب سے بڑی نیکی ہے پس اگر انتقال خون کے ذریعہ کسی کی جان کے بچ جانے کے آثار دکھائی دے رہے ہوں تو اس کی جان کو اس طریقہ سے بچانا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن درج بالا فقہی قاعدہ کے لیے چند قیود بھی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

الضرر لا یزال بمثله (۲۹) ضرر کو اس کے مثل ضرر سے زائل نہیں کیا جائے گا۔

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کسی کو نقصان سے بچاتے ہوئے اسی طرح کا کوئی اور نقصان ہونے کا اندیشہ ہرگز نہ ہو پس کسی کی جان کو بچانے کے لیے کسی ایسے انسان کا خون نکال کر بیمار کے

بدن میں منتقل کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جس کا خون نکالنے سے اس کی اپنی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے۔

الضرر الاشد یزال بالضرر الاخف۔(۳۰) شدید ضرر کو خفیف ضرر سے زائل کیا جائے گا۔

کسی سخت نقصان کا ازالہ اگر نسبتاً کم نقصان سے ممکن ہو تو اس کم نقصان کو برداشت کیا جاسکتا ہے مثلاً کسی بیمار کی جان کو بچانے کے لیے خون دینے والے کے جسم میں کمزوری یا بیماری کا اندیشہ ہو تو اس کمزوری اور بیماری کے خفیف نقصان کو برداشت کرتے ہوئے بیمار کو خون دے کر اس کی جان بچائی جاسکتی ہے۔

یختار اھون الشرین او اخف الضررین۔(۳۱) جب دو نقصان بیک وقت درپیش ہوں تو ان میں سے شدید نقصان سے بچتے ہوئے خفیف اور ہلکے نقصان کو برداشت کرلیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی رو سے جب ہمارے سامنے صورت حال کچھ اس طرح ہوجائے کہ کسی کا خون لینے سے اس کے جسم میں صرف کمزوری واقع ہونے کا اندیشہ ہو جب کہ نہ منتقل کرنے کی صورت میں کسی کی جان ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو یہاں اگرچہ دو نقصان بیک وقت درپیش ہیں لیکن پہلا نقصان دوسرے کے مقابلہ میں خفیف اور کم ہے اور دوسرا نقصان شدید اور زیادہ ہے لہٰذا قاعدہ بالا کی رو سے پہلے نقصان کو اختیار کرلیا جائے گا اور خون دینا نہ دینے سے بہتر ہوگا۔

الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة کانت او خاصة۔(۳۲) حاجت کا درجہ ضرورت سے کم ہوتا ہے۔

ضرورت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر وہ ممنوعہ کام کا ارتکاب نہ کرے تو اس کی ہلاکت یقینی ہو یا وہ ہلاکت کے قریب ہوجائے ایسی صورت میں تو حرام چیز مباح ہوجاتی ہے مگر حاجت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر اس کی حاجت پوری نہ ہو تو وہ ہلاک تو نہ ہوگا مگر وہ مشقت اور تکلیف میں ضرور مبتلا ہوگا یہ چیز حرام کو مباح تو نہیں کرتی مگر عمومی قواعد میں اس حاجت سے نکلنے کی راہیں بھی ملتی ہیں چنانچہ ایک قاعدہ یہ بھی کہ:

و الحاجة اذا عمت کانت جب کسی چیز کی حاجت عام ہوجائے تو اس کو

ضروریـةِ (۳۳) ضرورت کا درجہ مل جاتا ہے۔

تو اس حاجت کو ضرورت کا درجہ مل جاتا ہے اور جب اس کو ضرورت مان لیا جائے تو اس پر بھی ضرورت کے مندرجہ بالا تمام قواعد لاگو ہوں گے۔

مصالح شریعت سے مراد وہ امور یا چیزیں ہیں جن کی رعایت اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے یا نقصان سے بچانے کی غرض سے اس طرح کی گئی ہو کہ اگر انہیں عقل کے سامنے پیش کیا جائے تو عقل ان کو قبول کرے اور ان کے ذریعہ شرعی اصول وہدایت کی نفی نہ ہوتی ہو، مصالح شرعیہ کا حاصل یہ ہے کہ امر ضروری دین کی حفاظت کی جائے اور دین اسلام میں لازم آنے والے حرج کو رفع کیا جائے، ان دلائل کے علاوہ اس میں درج ذیل شرعی مصالح بھی پائے جاتے ہیں

مقاصد شریعت کے موافق تر ہے: انسانی جان کی حفاظت اور اسکے بدن کی سلامتی شریعت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے اور اس پر شریعت اسلامیہ کے بہت سے احکام کا مدار ہے۔ چنانچہ نوع انسانی کی بقا اور تحفظ کی خاطر اور نسل انسانی کی افزائش کے لیے شادی نکاح کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے اور اپنی جان کی حفاظت فرض قرار دی گئی ہے اسی مقصد کے پیش نظر کھانے پینے رہائش لباس اور خوراک کو بنیادی ضروریات کا درجہ دیا گیا اور جو انسان کسی کی جان پر تعدی کرتا ہے اس کے لیے قصاص، دیت اور کفارہ جیسے احکامات عائد کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ خود انسان کو جان بوجھ کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لاَ تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (۳۴) اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں۔

جان کی حفاظت اور جان کو نقصان سے بچانا شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے خواہ اس مقصد کے لیے حرام یا نجس چیز کا استعمال ناگزیر کیوں نہ ہو حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کے قصہ کے ساتھ ساتھ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ کسی کی جان بچانا بہت بڑی نیکی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِيْ إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ

اسی وجہ سے (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو سوائے قصاص کے اور زمین مین فساد برپا کرنے کے تو گویا اس نے

النَّاسَ جَمِيْعاً۔ (۳۵)	قتل کردیا تمام انسانوں کو۔

اور جب جان کنی کا عالم ہو، موت کسی انسان کے سر پہ منڈلا رہی ہو تو اس کو خون کا عطیہ دے کر موت کے منہ سے بچانا اور ہلاکت سے محفوظ رکھنا احیاء النفس نہیں تو اور کیا ہے؟ فتح القدیر میں امام شوکانی نے حضرت مجاہد کا قول روایت کیا ہے:

روی عن مجاهد ان احیائها انجائها من غرق او حرق او تهلكة او هدم۔ (۳۶)	حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ احیاء النفس کا معنی جان بچانا ہے یعنی کسی کی جان کو ڈوبنے، جلنے، ہلاک ہونے یا گرنے سے بچانا ہے۔

شیخ محمد رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں لکھا ہے:

من كان سبباً لحياة نفس واحدة بانقاذها من موت كانت مشرفة عليه فكانما احيا الناس جميعاً لان الباعث له على انقاذ الواحدة هو الرحمة و الشفقة و معرفة قيمة الحياة الانسانية واحترامها والوقوف عند حدود الشريعة في حقوقها تندغم فيه جميع حقوق الناس عليه فهو دليل على انه اذا استطاع ان ينقذهم كلهم من هلكه يراهم مشرفين على الوقوع فيها لاينى فى ذالک ولا يدخر وسعاً ومن كان كذلك لا يقصر في حق من حقوق البشر عليه ثم قال الآيه تعلمنا ما يجب من وحدة البشر وحرص كل واحد	پس جو آدمی کسی ایسی جان کو جو کہ موت کے قریب ہو بچا کر نفس واحد کی حیات کا سبب بنے گا تو گویا کہ اس نے ساری انسانیت کو زندہ کیا کیونکہ اس کو اس ایک جان کو بچانے پر ابھارنے والی چیز جذبہ رحم دلی اور شفقت ہے اور انسانی جان کی قیمت اور اس کی عزت وحرمت سے آگاہی اور اس کے حقوق سے متعلقہ شرعی حدود سے واقفیت نے اس کو یہ کام کرنے پر برانگیختہ کیا پس کسی ایک جان کو بچانے والا اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس ایک جان کے حقوق میں ساری انسانیت کے حقوق شامل ہیں اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ کسی موقع پر بالفرض اگر سارے انسانوں یا بہت سے انسانوں کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اپنی استطاعت کے مطابق ان کو اس سے بچانے کی بھرپور کوشش کرے گا اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑے گا

منهم علىٰ حيو ة الجميع و القيام بحق الفرد من حيث انه عضو من النوع۔(۳۷)	اور جو آدمی ایسی فکر کا حامل ہو وہ انسانی حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرسکتا۔ پھر انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ وحدت انسانی ضروری ہے اور ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ وہ تمام انسانیت کی حیات اور بقاء پر حریص ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فرد کے حقوق ادا کرے اس حقیت سے کہ وہ بھی نوع انسانی کا ایک فرد اور عضو ہے۔

درج بالا عبارت سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن جریر (۳۸) سے لے کر دور حاضر کے مفسرین تک تمام علماء تفسیر کی رائے یہ ہے کہ آیت **و من احیاھا فکانها احیا الناس جمیعا** (۳۹) ایک ایسے عمومی احیاء پر دلالت کرتی ہے جس میں کسی جان کو ہلاکت سے بچانا بھی شامل ہے۔ جس ہلاکت کے وہ قریب ہو اور بلاشک وریب جب کوئی آدمی کسی ایسی بیماری کا شکار ہو جس میں اس کی جان کی حفاظت اس کو کسی کا خون منتقل کیے بغیر ممکن نظر آتی ہو تو انتقال خون کے ذریعہ اس کی جان کو ہلاکت سے بچا لینا یقیناً احیاء النفس کے زمرے میں داخل ہوگا اور اسی چیز کو قرآنی آیت میں پوری انسانیت کو زندگی دینا کہا گیا ہے جو صرف جائز ہی نہیں بلکہ شریعت کا مطلوب و مقصود ہے۔

ضرورت اور حاجت کا تقاضا ہے: انتقال خون کے جواز کا حکم اس لیے بھی دیا گیا ہے کہ یہ ضرورت کا تقاضا ہے اور حاجت اس کی داعی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک مریض کو جب آپریشن کی وجہ سے یا کسی اور بیماری کی وجہ سے موت کا خطرہ لاحق ہو تو اس کو کسی صحیح الجسم زندہ انسان کے خون کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر اس کے لیے کسی ایسے شخص کا خون تجویز کرتے ہیں جو پیچیدہ بڑی بیماریوں سے محفوظ ہو اور جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے اور وہ یہ کہ خون تمام خرابیوں سے پاک ہے اور مریض کے خون کے گروپ کے موافق ہو اور انہیں قوی امید ہو کہ یہ جسم اس خون کو قبول کرے گا۔ اس کی مدد سے اس کے جسم میں ہونے والی خون کی کمی کی تلافی بھی ہو جائے گی اور کوئی صحت مند، قوی، صحیح الجسم اپنے خون میں سے کچھ حصہ اس کو تبرعاً دینے پر رضامند بھی ہو۔ مزید برآں اس سے صحیح آدمی کا خون بہنے سے اس کی جان کا اندیشہ یا ہلاکت کا خطرہ بھی نہ ہو۔ یا محض معمولی سے

نقصان کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں اس صحیح اور تندرست آدمی کا خون بیمار کے جسم میں منتقل کرنا جائز ہوگا۔ بلکہ بعض اوقات جب انتہائی خطرے کے وقت اس کی حالت شدید ہوگی تو مستحب یا واجب بھی ہوگا۔ الغرض حاجت کی شدت اور خطرے کے تفاوت کے اعتبار سے انتقال خون کبھی جائز، کبھی مستحب اور کبھی واجب ہوگا۔

اخوت کا تقاضا ہے: اخوت اسلامی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے جس پر پورے اسلامی معاشرے کی عمارت قائم ہے ملت اسلامیہ کی زندگی میں اخوت اور بھائی چارے کے آثار نمایاں ہیں اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اخوت کے ایسے رشتے میں منسلک کیا ہے جو نسبی اخوت سے بدرجہا فائق اور عالی رشتہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔(۴۰) بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه اخبره ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال المسلم اخو المسلم۔(۴۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔

ان احکامات شرعیہ میں اخوت و ہمدردی کا درس دیا جارہا ہے اور اخوت کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز کی حاجت نہ ہو وہ اپنے مسلمان بھائی کو دے دے بالخصوص جب اس مسلمان بھائی کو اس چیز کی ضرورت بھی ہو یا اس کو اس سے زیادہ ضرورت ہو اور انتقال خون کی بنیادی شرائط اور ضوابط میں یہ فلسفہ کارفرما ہے کہ جب ایک ماہر طبیب اس بات کا پختہ یقین دلاتا ہے کہ اس انسان کے جسم سے جس قدر خون لیا جائے گا وہ اس کے جسم کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوگا کیونکہ اس کے جسم میں خون کافی مقدار ہے اور خون لینے کی وجہ سے جسم میں رونما ہونے والی خون کی معمولی سی کمی کو تھوڑی سی غذا کے عوض پورا کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسری طرف اس کے دینی یا قومی بھائی کو اس خون کی فوری طور پر سخت حاجت اور شدید ضرورت ہے۔ جو غذا کی بڑی سے بڑی مقدار کے عوض میں بھی پوری نہیں ہوسکتی۔ پس اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان کو جب اس کے خون کی ضرورت اس

کی اپنی ضرورت سے بہت زیادہ ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی ضرورت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرے۔

حدیث شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن ابی سعید خدری رضی اللّٰہ تعالی عنه قال بینما نحن فی السفر مع النبیؐ اذ جاء رجل علی راحلته له قال فجعل یصرف بصره یمیناً و شمالاً فقال رسول اللّٰہ ﷺ من کان معه فضل ظھر فلیعد به علی من لا ظھر له و من کان له فضل من زاد فلیعد به علی من لا زاد له فذکر من اصناف المال ماذکر حتیٰ رأینا انه لاحق لاحد منا فی فضل۔(۴۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اس اثناء میں کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے نکلے جبکہ ایک آدمی آیا اور وہ دائیں بائیں نظر پھیرنے لگا تو رسول اللہؐ نے فرمایا جس کے پاس زائد سواری ہو تو وہ اس کو صدقہ کر دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد زادراہ ہو وہ اس کو صدقہ کر دے جس کے پاس زادراہ نہ ہو پس حضور نبی اکرمؐ نے اس طرح مال کی کئی انواع کا ذکر کیا راوی بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ ہم نے یوں سمجھا کہ زائد مال میں سے ہم میں سے کسی کا کوئی حق نہیں (بلکہ مہمان کا حق ہے)۔

اسی طرح حضور نبی رحمتؐ نے اس زائد پانی کے بارے میں فرمایا جس کی ضرورت لوگوں کو اپنی کھیتیاں سیراب کرنے کے لیے ہوتی ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالی عنه یقول قال رسول اللّٰہ ﷺ لا یباع فضل الماء لیمنع به الکلأ۔(۴۳)

جب کوئی آدمی اپنی کھیتی کو سیراب کر لے اور اس کے پاس کچھ پانی باقی بچ جائے جس کی اسے حاجت نہ ہو تو اس کے لیے اس پانی کو بیچنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ کسی کو اس پانی سے نفع حاصل کرنے سے روکے۔

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی انسان کی ملکیت میں چٹیل میدان میں ایک کنواں ہو جس کا پانی اس کی ضرورت سے زائد ہو اور وہاں پہ ایک چراگاہ ہو جس کو سیراب کرنے کے

لیے اس کنواں کے علاوہ کوئی اور پانی نہ ہو اور چرواہے جب تک اس کنویں کا پانی استعمال نہ کریں وہ اس چراگاہ کو آباد نہ رکھ سکتے ہوں تو اس کنویں کے مالک پر حرام ہوگا اس زائد پانی کو استعمال کرنے سے اسے روکے بلکہ اس پہ واجب ہوگا کہ بلاعوض وہ پانی ان کو دے دے کیونکہ اگر وہ انہیں پانی استعمال کرنے سے روکے گا تو چراگاہ بے آب و گیاہ خشک اور ویران ہو جائے گی اور مویشی پیاس سے مرجائیں گے۔

درج بالا احادیث میں غور کرنے سے جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی آدمی کی ملکیت میں موجود اس کی ضرورت سے زائد پانی کی جانوروں کے پینے کے لیے سخت ضرورت ہو تو اس آدمی پہ اپنے مسلمان بھائی کے جانوروں کی ضرورت پوری کرنا لازم ہے تو کیا خیال ہے اس انسان کے بارے میں جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت وتکریم کا تاج پہنایا اور زمین وآسمان میں موجودہ تمام ذخائر اس کے لیے مسخر فرمادیے اسے جب اپنے بھائی کے زائد خون کی ضرورت ہوتا کہ وہ اپنی جان کو ہلاکت سے بچا سکے اور اس میں خون دینے والے کے کسی بھاری یا شدید نقصان کا احتمال بھی ہوتا کیا اس کے لیے اپنے بھائی کو خون کا عطیہ دینا جائز نہ ہوگا، نہیں صرف جائز ہی نہیں بلکہ اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اس پر واجب اور لازم ہو۔

ایثار کو متضمن ہے: ایثار اسلام کے مبادی اصولوں اور اہم تعلیمات میں سے ہے ایثار سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کی مصلحت اپنی مصلحت پر ترجیح دے پس وہ اپنے حصہ اور حق کو اپنے بھائی کی خاطر ترک بھی کرسکتا ہے اور یہ اعلیٰ ترین خلق ہے جبکہ انسان طبعی طور پر انا پسند ہے اور ہمیشہ اپنی بھلائی اور ذاتی منفعت کو پسند کرتا ہے لیکن یہ ایک ایسی فکر ہے جو ملت اسلامیہ کی اجتماعیت کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ اس فکر کا حامل انسان ہمیشہ اپنی ذاتی اور انفرادی منفعت کا خواہاں ہوتا ہے اپنے قومی بھائیوں اور اپنی ملت کی فلاح و بہبود کی فکر سے عاری ہوتا ہے جبکہ اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے اس رذیل اور گھٹیا فکر کی بیخ کنی، الحب فی اللہ کے ذریعہ کرتا ہے ایمان کے عناصر میں یہی چیز بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا:
لایؤمن احدکم حتی یحب لاخیه	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن

مایحب لنفسہ۔(۴۴) نہیں ہوسکتا حتی کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے وہ پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

پس الحب فی اللہ اور الحب للہ ایمان کے بنیادی تقاضے ہیں جن کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اہل ایمان بھائیوں کی ضرورت اور حاجات کو اپنی حاجات اور ضروریات پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے بھائیوں کے لیے وہی چیز پسند کرے جس کی خواہش وہ اپنے لیے رکھتا ہو اسلام میں بھائی کی ضرورت کو صرف اپنی ضرورت کے برابر کا درجہ دینے کی ہی تلقین نہیں کی گئی بلکہ بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینے کی ترغیب دے کر جذبہ انانیت کو ختم کر کے ایثار پر ابھارا گیا ہے۔ جس طرح اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں انصار صحابہ کرامؓ کی مہاجرین مدینہ کے لیے سخاوت، محبت اور مثالی ایثار کی طرف اشارہ دیا ہے جنھوں نے اپنے گھروں کے فاقہ اور فقر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بھائیوں کی نصرت اور اعانت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔(۴۵) اور ترجیح دیتے ہیں انہیں اپنے آپ پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو۔

پس جب ایک مسلمان آدمی اپنی اشیائے ضرورت اور کھانے پینے کی اشیاء میں اپنے بھائی کے ساتھ ایثار کرے گا تو یہ اس مسلمان کا ایثار کرنا احسان نہیں بلکہ دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے اگرچہ اس ایثار کی وجہ سے اس کی خوراک میں کمی واقع ہو اور یہ خوراک کی کمی اس کی جسمانی کمزوری کا سبب بن جائے تو جب اپنے اسی بھائی کی جان خطرے میں ہو تو اس خوراک سے بننے والے خون کو اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے پیش کر دینا یقیناً ایثار کا اعلیٰ ترین عملی مظاہرہ ہے اس لیے اپنے مسلمان بھائی کی جان کے احیاء کے لیے خون ہبہ کرنا خلاف شریعت نہیں بلکہ عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوگا۔

خون کا عطیہ مانند ہبہ ہے: ہبہ، ہدیہ اور عطیہ ایسے افعال ہیں جن کی شریعت اسلامیہ میں ترغیب و تحریص کی گئی ہے اور یہ بھی مکارم اخلاق میں سے ہے ہیں اور جود و سخا پر دلالت کرتے ہیں قرآن کریم میں ہبہ کو اللہ تعالیٰ کا وصف کمال ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

ام عندھم خزائن رحمة ربک العزیز الوھاب۔ (۴۶) کیا ان کے قبضہ میں ہیں خزانے آپ کے رب کی رحمت کے جو عزت والا بے حساب عطا کرنے والا ہے۔

پس جو آدمی ہبہ کرے وہ ایک بہت بڑے شرف کو پالیتا ہے کیونکہ ہبہ کرنے والے کا نفس لالچ اور حرص سے پاک ہوجاتا ہے اس عمل سے موہوب لہ کا دل شاداں اور فرحاں ہوجاتا ہے اور دونوں کے درمیان باہمی محبت اور مودت پروان چڑھتی ہے نفرت، کینہ، بغض، حسد اور عناد جیسی صفات قبیحہ سے دل پاک صاف ہوجاتے ہیں لہٰذا اس کے وصف کمال ہونے میں کوئی شک نہیں اور فقہاء کے نزدیک ہبہ کہتے ہیں۔

تملیک عین بلاعوض۔ (۴۷) کسی چیز کی اصل کا بغیر کسی عوض کے کسی کو مالک بنا دینا۔

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھادوا تحابوا۔ (۴۸) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو باہمی محبت میں اضافہ ہوگا۔

پس ہدیہ اور ہبہ ایسی چیزیں ہیں جو سینے کی میل کچیل کو جذب کرلیتی ہیں پس نبی اکرمؐ خود بھی ہدیہ دیتے تھے اور ہدیہ کو قبول بھی فرماتے تھے آپؐ کا ہدایا لینے اور دینے کا عمل صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ آپؐ نے کفار کے ہدایا کو قبول فرمانے کے ساتھ ساتھ ان کی طرف ہدیے بھیجے بھی ہیں ان اسلامی تعلیمات سے معلوم ہوا کہ ہدیہ لینا اور دینا اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے اسی طرح اپنے بھائی کو خون کا عطیہ دینا بھی کسی طور پر ہبہ اور ہدیہ سے کم عمل نہیں لہٰذا یہ بھی ایک وصف کمال ہے جو مسلمانوں کے درمیان باہمی محبت، اخوت اور مودت کے فروغ کا وسیلہ ہے اور نفرتوں، بغض و عناد کی بیخ کنی کا ذریعہ ہیں۔

خلاصہ بحث: انتقال خون کا مفہوم یہ ہے کہ کسی جسم سے خون نکال کر دوسرے جسم میں داخل کرنا ہے حالت اختیار میں انتقال خون ممنوع ہے کیونکہ یہ محرمات میں سے ہے اور شریعت اسلامیہ اختیار کے وقت محرمات کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ خشکی کے جانوروں کا بہنے والا خون جب تک ان کے جسم کے اندر رہے جسم کے دیگر اجزاء کی طرح پاک ہوتا ہے اور جب یہ جسم سے بہتا ہوا باہر نکلے تو ناپاک ہوجاتا ہے۔

حالت اضطرار خون کا انتقال جائز ہے کیونکہ قرآن وحدیث،قواعد فقہیہ اور اقوال فقہاء اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حالت اضطرار میں محرمات کا استعمال بقدر ضرورت جائز ہے اسی طرح خون کے ہبہ کرنے میں اخوت،ایثار،ہبہ جیسے شرعی مصالح پائے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱)الرازی،محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر،مختار الصحاح،تحقیق محمود خاطر،بیروت: مکتبہ ناشرون،۱۴۱۵ھ،ص ۱۳۲۔

(۲) مزید دیکھیے ابن منظور،محمد بن جلال الدین،لسان العرب،بیروت،دار صادر،۱۴۲۰ھ،ج ۱۴،ص ۲۶۸۔

(۳)مزید دیکھیے الفیومی،احمد بن محمد بن علی،المقری،المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی،بیروت:المکتبۃ العلمیہ،س۔ن،ج ۱،ص ۲۰۰۔(۴) کنعان،احمد محمد کنعان،الخیاط،محمد ہیثم،الموسوعۃ الطبیۃ الفقھیۃ،بیروت: دار النفائس،۱۴۲۰ھ،ص ۴۶۲۔(۵) مجمع الفقہ الاسلامی جدہ،مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی،العدد ۱۱،جدہ،مکتبہ مجمع الفقہ الاسلامی،س۔ن،ج ۴،ص:۲۴۵۔(۶) شوکانی،محمد بن علی بن محمد،السبیل الجرار المتدفق علی حدائق الازہار تحقیق محمود ابراہیم زاہد،بیروت: دار الکتب العلمیہ،۱۴۰۵ھ،ج ۱،ص ۳۵ومابعد صدیق حسن خان،محمد صدیق خان بن حسن بن علی بن لطف اللہ الحسینی،ابوالطیب،البخاری،الروضۃ الندیہ شرح الدرالبہیۃ،بیروت: دارالمعرفہ،س۔ن، ج ۱،ص ۱۵۔ابن عثیمین،محمد بن صالح،الشرح الممتع علی زاد المستقنع،القاہرۃ: دار الآثار،س۔ن،ج ۱،ص ۲۶۰ و مابعد البانی،محمد ناصر الدین،تمام المنۃ فی التعلیق علی فقہ السنہ،ریاض:مکتبۃ المعارف،۲۰۰۲ء،ج ۱،ص ۵۰۔(۷) حصکفی،علاوالدین،محمد بن علی بن محمد،الدرالمختار شرح تنویر الابصار فی فقہ مذہب الامام ابی حنیفہ النعمان،بیروت: دار الفکر،۱۳۸۶ھ،ج ۱،ص ۳۹۰۔ابن نجیم،زین الدین بن ابراہیم،البحر الرائق شرح کنز الدقائق،بیروت: دار المعرفہ،۱۴۱۳ھ،ج ۱،ص ۲۲۲۔ابن ہمام،کمال الدین،محمد بن عبدالواحد،شرح فتح القدیر،بیروت: دار الفکر،س۔ن،ج ۱،ص ۱۹۴۔(۸)ابن عربی،ابوبکر محمد بن عبداللہ،احکام القرآن،تحقیق محمد عبدالقادر عطاء،بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۸ھ،ج ۱،ص ۵۳۔القرطبی،احمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح،الجامع لاحکام القرآن،بیروت: داراحیاء التراث العربی،۱۴۰۵ھ،ج ۲،ص ۱۴۹۔الکشناوی،ابوبکر بن حسن،اسہل المدارک شرح ارشاد المسالک،بیروت،دار صادر،س۔ن،ج ۲،ص ۶۴۔(۹)النووی،الامام،یحی بن شرف،کتاب المجموع شرح المہذب للشیرازی،بیروت: دار الفکر ۱۹۹۷ء،ج ۲،ص ۵۵۶۔النووی،الامام،یحی بن شرف،روضۃ الطالبین،بیروت: المکتب الاسلامی،

۱۴۰۵ھ، ج ا،ص ۱۶۔ (۱۰) ابن مفلح شمس الدین المقدسی،عبداللہ محمد بن مفلح، کتاب الفروع، بیروت: دارالفکر، ج ا،ص ۲۵۳۔المرداوی، علاء الدین، ابوالحسین،علی بن سلیمان، الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف، تحقیق محمد حامدالفقی، بیروت: دارالاحیاءالتراث العربی،س۔ن، ج ا،ص ۳۲۵ و مابعد۔(۱۱) ابن تیمیہ،تقی الدین، احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ، مجموع الفتاوی، تحقیق انورالباز، بیروت: دارالمعرفہ،۱۴۲۶ھ، ج ۲۱،ص ۲۲۲ تا ۵۹۸۔(۱۲) البقرۃ (۲): ۱۷۲۔ (۱۳) الانعام (۶): ۱۴۳۔ (۱۴) الانعام (۶): ۱۱۹۔ (۱۵) شوکانی، محمد بن علی بن محمد، نیل الاوطارمن احادیث سیدالاخیارشرح منتقی الاخبار بیروت: دارالجیل ، ۱۹۷۳ء، ج ۹،ص ۹۱۔ ابن عابدین، محمد بن امین بن عمر بن عبدالعزیز، حاشیہ ردالمحتارعلی الدرالمختار، بیروت: دارالفکر، ۱۴۲۱ھ، ج ۴،ص ۲۱۵۔ کتاب المجموع: ج ۹،ص ۴۱۔البہو تی، منصور بن یونس بن ادریس، کشاف القناع عن متن الاقناع تحقیق مصطفی ہلال، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۲ھ، ج ۲،ص ۷۷۔ ابن حزم، ابی محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم، المحلی تحقیق احمد محمد شاکر بیروت: دار الفکر، س۔ن، ج ا،ص ۱۷۷۔ (۱۶) الحج (۲۲): ۷۷۔ (۱۷) الحشر (۵۹): ۹۔ (۱۸) بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ، الجامع المسندالصحیح المختصر، کتاب الطب، باب الحجامۃ علی الراس، بیروت: دارابن کثیر، ۱۴۰۷ھ، رقم الحدیث: ۵۳۷۳۔ (۱۹) صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الحجامۃ من الداء، رقم الحدیث: ۵۳۷۲۔ (۲۰) صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الحجامۃ من الداء، رقم الحدیث: ۵۳۷۱۔ باب الشفاء فی ثلاث، حدیث نمبر ۵۳۵۶۔ مسلم، الامام، ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب حل اجرۃ الحجامۃ، بیروت: داراحیاء التراث العربی، س۔ن، رقم الحدیث: ۳۰۴۹۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب لکل داء دواء واستحباب التداوی، رقم الحدیث: ۲۲۰۷۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابوعبداللہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، باب الکی، بیروت: دارالاحیاء التراث العربی، س۔ن، رقم الحدیث: ۳۴۹۱۔ (۲۲) ابن حجر، شہاب الدین، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری شرح صحیح بخاری، بیروت: دارالمعرفہ ۱۳۷۹ھ، ج ۲،ص ۱۱۴۔ مجموع الفتاویٰ: ج ۳۰،ص ۱۹۴۔ ابن قیم الجوزی، ابوعبداللہ، محمد بن ابی بکر، زادالمعادفی ہدی خیرالعباد، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۳۷۹ھ، ج ۴،ص ۵۹۔ مجموعہ من العلماء، الموسوسۃ الفقہیہ الکویتیہ، الکویت: وزارۃ الاوقاف، ج ۱۷،ص ۱۴۔ (۲۳) جماعۃ من علماء الہند، الفتاویٰ الہندیہ، مصر: المطبعۃ الامیریہ، س۔ن، ج ۵،ص ۳۵۵۔ (۲۴) الجامع لاحکام القرآن: ج ا،ص ۶۰۷۔ (۲۵) الفتاویٰ الہندیہ، ج ا،ص ۱۱۲۔ (۲۶) سیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر، الاشباہ والنظائر فی قواعد فروع الشافعیہ، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ، ص: ۹۳۔ (۲۷) الاشباہ والنظائر لسیوطی، ص: ۶۸۔ (۲۸) ابن نجیم،

زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم، الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفہ النعمان، بیروت، دارالکتب العلمیہ، س۔ن، ص ۱۰۲۔(۲۹) الاشباہ والنظائر لسیوطی، ص:۸۶۔(۳۰) الاشباہ والنظائر لابن نجیم ص:۵۴۔(۳۱) الاشباہ والنظائر لسیوطی، ص:۴۵۔(۳۲) الاشباہ والنظائر لابن نجیم ص:۸۷۔(۳۳) الاشباہ والنظائر لسیوطی، ص:۸۷۔(۳۴) البقرۃ(۲):۱۹۵۔(۳۵) المائدہ(۵):۳۲۔(۳۶) الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، بیروت: دارالوفا، ۱۴۱۸ھ، ج ۳، ص ۱۴۳۔(۳۷) محمد رشید رضا، علامہ، تفسیر المنار، بیروت: دارالمعرفہ، ۱۴۲۱ھ، ج۶، ص ۳۴۹۔(۳۸) الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد، تفسیر الطبری المسمّیٰ جامع البیان تاویل القرآن، بیروت، موسسۃ الرسالہ، ۱۴۲۰ھ، ج ۵، ص ۲۰۰۔(۳۹) المائدہ(۵):۳۲۔(۴۰) حجرات(۴۹):۱۰۔(۴۱) صحیح بخاری: کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ، رقم الحدیث ۲۲۶۲۔(۴۲) صحیح مسلم: کتاب اللقطۃ باب استحباب المواساۃ بفضول المال، رقم الحدیث ۳۳۰۸۔ (۴۳) صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب تحریم فضل الماء الذی یکون بالفلاۃ و یحتاج الیہ لرعی الکا وتحریم منع بذلہ وتحریم بیع ضراب الفحل، رقم الحدیث:۲۹۷۹۔(۴۴) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ، رقم الحدیث ۱۲۔(۴۵) الحشر(۵۹):۹۔ (۴۶) ص ۳۸:۹۔(۴۷) ابوحبیب، الدکتور سعدی ابوحبیب، القاموس الفقہی لغۃ واصطلاحا، دمشق، دارالفکر، ص: ۲۴۳۔(۴۸) الطبرانی سلیمان بن احمد بن ایوب، ابوالقاسم الطبرانی، المعجم الاوسط، القاہرۃ، دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ، ج ۷، ص ۱۹۰، رقم الحدیث، ۷۲۴۰۔

محقق وادیب دانشور مولانا عبدالسلام خاں

جناب ابوذر عبدالاحد فرقانی

خطۂ فلسطین جہاں قبلۂ اول واقع ہے اس ارض پاک کو ارض الانبیاء کہا گیا ہے وہ اس لیے کہ وہاں ایک ہی قبیلہ بلکہ ایک ہی خاندان میں سلسلہ بسلسلہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل بھیجے جن کا تذکرہ قرآن کریم کی سورہ انبیاء میں اور پورے قرآن کریم میں جا بجا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ آخری دین جس نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا اگرچہ ملک عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی رسالت میں آیا اور پوری دنیا کو منور و مہذب کر دیا مگر اس آخری دین کی ترویج و اشاعت سمرقند و بخارا، شیراز و اصفہان جیسے مراکز سے بڑی شد و مد سے ہوئی۔ امام اعظم نعمان بن ثابت یعنی امام ابوحنیفہ، امام غزالی، مولانا رومی و رازی، حافظ و سعدی جیسے مبلغ، مدبر اور مفکر اسی خطہ سے پیدا ہوئے اس لیے اس علاقہ کو بڑا امتیاز و شرف حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی علمی مرکز بالخصوص علوم شرقیہ میں ممتاز علاقہ کو شیراز و اصفہان سے تشبیہ و تمثیل دی جاتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ایک چھوٹا سا شہر ''رام پور'' مذکورہ علمی مراکز سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ہم اپنے وطن کی محبت میں غلو کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ مبالغہ آرائی بھی نہیں بلکہ امام الشعراء مرزا غالب کے الفاظ ہیں ''رام پور کہاں ہے، روکش شیراز و اصفہان ہے'' دیگر اہل نظر کی منظوم رائے میں ؎

مرکز ادب کا ، روح سخن رام پور ہے یہ شمع وہ ہے جس کا زمانہ میں نور ہے

فلسطین کی طرح یہاں بھی خاندان کے خاندان علوم و فنون کے منبع و مخرج اور سرچشمے رہے۔ گویا رام پور بھی ارض العلماء تھا شاعروں اور ادیبوں کا یہاں ایک جہاں آباد تھا۔ بقول ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ریاست رام پور اپنی کم آبادی اور رقبہ کے باوجود علم اور علماء کا بڑا قدرداں تھا۔ اس لیے ہندوستان کے

(سابق منیجر ایس۔ بی۔ آئی۔)، رامپور، یوپی، انڈیا۔ (Mob:09456217121)

دور دراز علاقوں سے علمائے دین، صوفیائے کرام، اطباء، فلاسفہ اور پیشہ ور حضرات یہاں آ کر اکٹھا ہو گئے۔ یہی نہیں دیگر فنون اور صنعتوں میں بھی کسی جگہ سے کم نہ تھا۔ محض شعر وسخن کی بات کریں تو شاعری کا تیسرا اسکول قرار دیا گیا۔ اس کے جغرافیہ سے جو لوگ واقف ہیں انہیں باور کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ نالا پار جیسے حاشیہ کے محلہ سے نعمانی خاندان کی نسلوں میں شاعری ایسی رچی بسی کہ غالباً جلیل خاں نعمانی کی پشت میں شاعر ہی شاعر ہوئے۔ محلہ پھلواڑ سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے آباء واجداد نسلاً بعد نسلٍ مع خواتین خاندان، تمام علوم دینی و دنیوی سے بدرجہ اتم آراستہ و پیراستہ اور باقاعدہ اسناد و اعزاز یافتہ ہیں۔ عرشی صاحب کا نہ صرف اپنا خاندان بلکہ ان کے دیگر عزیز و اقارب بھی کسی عنوان کم نہیں، ہم رتبہ و ہم سر ہی رہے۔ مولانا عرشی صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ''ماہر غالبیات'' مستند اور مکمل اتھارٹی گردانے گئے۔ تو ان کے برادر نسبتی اسحاق النبی خاں صاحب علوی علم ریاضی کے ماہر بالخصوص ہجری تقویم میں طاق اور قرآنیات میں عمیق مطالعہ کے ساتھ معانی و مفہوم میں تفکر اور اجتہاد بھی کرتے تھے۔ یعنی سند یافتہ مولوی نہ ہوتے ہوئے بھی مولوی ہی تھے۔ ان کے متعدد مقالے موقر جریدے ''برہان'' اور ''نقوش'' میں شائع ہوتے رہے۔ مولانا عرشی صاحب کے ایک اور عزیز محمد علی خاں عرف دولہا خاں الملقب ''خوش رقم'' فن خطاطی کے ماہر تھے جن کے مخطوطات کی نمائش متعدد جگہوں پہ ہوئی۔ مولانا عبدالسلام خاں صاحب مولانا عرشی کے نہ صرف اصطلاحی معنی میں ہم زلف تھے بلکہ لغوی معنی میں بھی بہرطور ہم زلف ہی تھے۔ مستند عالم دین ہونے کے علاوہ متعدد زبانوں پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی فارسی تو اس زمانے میں سب ہی جانتے تھے مولانا عبدالسلام خاں، فرانسیسی اور جرمنی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مزید برآں مولانا عرشی کے جواب میں ''ماہر اقبالیات'' تھے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم کے فلسفہ سے متاثر پایا تو مولانا عبدالسلام صاحب نے مولانا محمد جلال الدین رومی پر بھی تحقیقی مقالہ بلکہ ایک ضخیم کتاب تحریر کر کے ''رومیات'' پر بھی مہارت ثابت کر لی۔

واضح رہے کہ رام پور کے یہ سب لوگ باقاعدہ سند یافتہ عالم تھے لیکن محض روایتی مولویوں کی طرح مسجد میں امامت اور پند و موعظت تک محدود نہ رہے۔ بلکہ یہ علماء نائبین رسل تھے جنھوں نے حال و مستقبل دونوں کو سنوارنے کے ایسے کام کیے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام رہے۔ آنے والا ہر دن اور ادب کا ہر طالب عالم مرہون منت رہے گا۔

مولانا عبدالسلام خاں کو جب ہم نے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ طویل القامتی سے نہیں بلکہ منکسر المزاجی سے تھوڑے خمیدہ پشت ہو گئے تھے ویسے ان کی وضع قطع بلکہ یوں سمجھیے کہ مکمل Get-up مولانا ابوالکلام آزاد جیسا تھا۔ وہی فرنچ کٹ داڑھی، باوقار قد و قامت، شیروانی زیب تن، ہاتھ میں عصا، تبسم چہرہ پر علم کی ضیاء، آنکھوں میں دانش و بینش کی چمک اور ان پر ایک چشمہ، سبک خرامی اور لہجہ۔ لہجہ تو حیف کہ ہم نے سنا ہی نہیں "اپنا حصہ دور کا جلوہ" بس دور ہی سے دیکھا اور برسوں ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کا بھائی ہی سمجھتے رہے۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ بھائی نہیں تھے۔ بہر حال ہمارے قیاس کا بھرم یوں رہ گیا کہ معلوم ہوا کہ مولانا آزاد سے مراسم بہت اچھے رہے اور ملاقاتیں بھی۔ بہت سی قدریں بے شمار عادتیں اور شوق مشترک تھے مثلاً چائے نوشی نہایت نفاست و اہتمام سے، جیسمین کے دونوں ہی دل دادہ۔ پان لبوں کی شان غالباً مولانا عبدالسلام خاں کے لیے ہی مخصوص تھا۔ خوش خلقی، ملنساری، سلام کرنے میں پہل، جواب دینے میں عجلت، غیر مسلموں سے بھی اسی معیار کی پر خلوص دوستی، عجز و انکسار بڑے قابل ذکر خصائل تھے۔ چھوٹے لال جوہری اور لالہ رام بھروسے لال جگری دوستوں میں تھے جن کے افراد خانہ آج بھی اپنائیت کے جذبوں سے سرشار ہیں۔ مولانا آزاد پر اپنی زیرکی اور بصیرت ایسی ثابت کی کہ وزارت تعلیم کے تحت منصوبہ سازی اور مدارس کے نصاب کی تجدید کاری میں ان کی آراء شامل رہیں اور مولانا آزاد کی طرح ہی صاحب فہم و فراست اور صاحب قلم رہے۔

مولانا عبدالسلام خاں روہیلہ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلہ میں ایک معزز دینی علم و عمل والے حافظ عبدالغفار خاں کے چھوٹے بیٹے تھے جن کی تعلیم و تربیت بڑے بھائی مشہور عالم دین محدث و مفسر مولانا عبدالوہاب خاں کی نگہداشت میں ہوئی۔ مولانا عبدالوہاب خاں نے حفظ قرآن اور درس حدیث کے لیے رام پور میں ایک مدرسہ جامعۃ المعارف نام سے قائم کیا جو بحمداللہ آج بھی ہے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اس کا الحاق ہے، یہاں ملک کے دور دراز علاقوں سے طالبانِ علم آ کر فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالوہاب خاں رام پور کے سماجی اور سیاسی حلقہ میں بھی ایک ممتاز حیثیت اور اہمیت رکھتے تھے۔

مولانا عبدالسلام خاں جید عالم دین ہونے کے علاوہ اعلیٰ معیار کے محقق اور مصنف تھے۔ ان کی نگارشات ہندو پاک کے اعلیٰ ترین معیاری جرائد میں شائع ہوئیں۔ ہندوستان میں اعظم گڑھ

سے شائع ہونے والا ''معارف'' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں صرف تحقیقی مضامین ہی شائع ہوتے ہیں، مولانا کے تحقیقی مقالے اس میں بکثرت شائع ہوتے رہے ہے۔ خود مولانا پر ایک تحقیقی مقالہ مولانا کے عربی مضامین کے مجموعہ کی کتاب بعنوان الفلسفة الهندية القديمة کے جائزہ پر رام پور کی ہی ایک خاتون اسکالر ڈاکٹر تبسم صابر کی نگارش بھی اسی موقر جریدہ ''معارف'' کے مئی ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندومت کے فلسفہ پر چاروں ویدوں کے اصل ماخذ کا سنسکرت میں عمیق مطالعہ کا ماحصل مولانا نے بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ بدھ اور جین مذہب کے فلسفہ کا بھی اجمالی جائزہ اصل کتب سے لیا گیا ہے۔ اس سے مولانا کی تحقیقی ژرف نگاہی کے ساتھ سنسکرت سے واقفیت بھی آشکار ہوتی ہے۔ نثار احمد فاروقی کی فرمائش پر اس کتاب میں بھگوت گیتا اور چند مزید مقالات بھی شامل کیے گئے۔ نثار احمد فاروقی کی نظر میں رضا لائبریری کے ذمہ داروں کے لیے اس کتاب کی اشاعت باعث افتخار گردانی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا نے مولانا ابوالکلام آزاد کے حکم پر مذکورہ مقالے ''ثقافۃ الہند'' نام کے عربی مجلہ میں بھی شائع کرائے جس سے عربی دنیائے ادب میں ہندوستان کے مذاہب اور فلسفے متعارف ہوئے۔ ڈاکٹر تبسم صابر نے بڑی دیدہ ریزی اور جاں فشانی کی ہے۔ ان کا یہ مقالہ ایک گراں قدر دستاویز ہے جو بالخصوص ہندو، جین اور بدھ مذاہب پر بھی تحقیق کے طلبہ کے لیے Readyrecknor ہوگا۔ دراصل مولانا جو بھی ضبط تحریر میں لاتے بڑی محنت کر کے تمام تر حوالہ جات، تاریخی کتب اور مبصرین کی آراء و تنقید کے ساتھ ہوتا تھا۔

مولانا مرحوم کی بہو یعنی ناصر خاں صاحب ایڈوکیٹ کی بیگم محترمہ ساجدہ شیروانی نے بھی ایک مضمون میں مولانا کی مکمل سوانح پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں خاندان کے شجرہ کے ساتھ دیگر کوائف کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی معلومات اس لیے بھی وسیع و مستند ہیں کہ وہ خود اس خاندان کی ایک رکن ہیں۔ وہ مزید لکھ سکتی تھیں مگر کچھ احتیاط پیش نظر رہی ہوگی۔ محترمہ ساجدہ شیروانی نے مولانا مرحوم کی رام پور کے شہرۂ آفاق مدرسہ عالیہ سے وابستگی اور اس کے معیار کو پختگی کے ساتھ بلندیوں تک پہونچانے کی ان تھک کوششوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ مادر علمی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں تدریسی فرائض ادا کرنے کا موقع ملے۔ مولانا نہ صرف مدرس بلکہ صدر مدرس رہے اور اسی عہدۂ جلیلہ سے سبک دوش ہوئے۔ حالانکہ بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار

''یہ عہدہ مولانا کے لیے کوئی بڑا اعزاز نہ تھا، مدرسہ عالیہ کے لیے البتہ یہ ایک اعزاز کی بات تھی''۔ مولانا ایک بے مثل سوانح نگار تھے۔ طرز تحریر ایسا کہ قاری کی دل چسپی میں جستہ جستہ اضافہ ہوتا رہے۔

اک دن وہ مل گئے تھے سرراہ گزر کہیں　　پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں
حالت زخم دروں دیکھئے دل میں آکر　　چشم خوں بار تو ایک منظر بیرونی ہے
نگاہوں سے ہی غائب ہوگیا تو ہوش آیا　　کہ ان کمبخت ہاتھوں سے وہ دامن دور ہی کیا تھا

جیسے اشعار کے خالق رام پور کے ایک مشہور شاعر واجد علی اشک پر ایک مضمون تحریر کیا جو ان کی مکمل سوانح تھی۔ اس مضمون میں اپنی شاگردی (جرمنی و فرانسیسی زبانوں میں) کے ساتھ اشک صاحب سے باہمی رفاقت و ہم نشینی کے تذکرے کے بعد اشک صاحب کی علمی قابلیت، اعلیٰ ظرفی، دلداری و مہمان نوازی اور بے مثل کردار کے تمام گوشوں پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ اشک صاحب رام پور کے نواب خاندان کے ایک فرد تھے لیکن انہوں نے اس نسبت کو کبھی باعث افتخار یا قابل ذکر نہیں سمجھا بلکہ اپنی ذاتی زندگی آزادانہ طور پر گزارنے کے لیے نواب خاندان سے قابل لحاظ دوری رکھی۔ ہندوستان سے باہر حصول تعلیم کے لیے برطانیہ اور جرمنی میں بھی رہے اور وہاں بھی اپنے کردار کی عظمت اور علمی قابلیت کی چھاپ چھوڑی۔ جرمنی میں قیام کے دوران ریاست رام پور سے وظیفہ بند ہوا تو مضمون نگاری کو ذریعہ معاش بنالیا۔ تنگ دست رہے لیکن غیرت وحمیت اور خودداری پر آنچ نہ آنے دی۔ اشک صاحب کی والدہ نے مولانا محمد علی جوہر سے بمنت تمام برلن سے ان کے ہمراہ بلوالیا۔ مولانا محمد علی جوہر سے انتہائی مخلصانہ و برادرانہ تعلق تھا۔ ''قصہ از قصہ برخیزد'' کے مصداق مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے ساتھ ان کے فضائل بھی بیان کرنے میں مولانا عبدالسلام خاں نے تامل نہیں کیا۔ اس سے مولانا محمد علی جوہر کے بین الاقوامی تعلقات اور فکری معیار کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر ترکی کے مصطفیٰ کمال اتاترک سے ایک خیر سگالی ملاقات کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے نظریاتی اختلاف کی بنا پر پہلوتہی کی۔ مولانا کو بڑا شاق گزرا۔ انہوں نے عصمت انونو سے جو اتاترک کے دست راست تھے کہا کہ اتاترک سے کہہ دینا کہ اس نے ایک ایسے شخص سے ملاقات پسند نہیں کی جس نے ترکی کے لیے ہر ایک ترک سے زیادہ کام کیا ہے۔ ''میرے تربیت یافتہ جوانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مصطفیٰ کمال کی برابری کرسکتے ہیں''۔ بہرحال بات تو واجد علی اشک عرف اچھن صاحب کی ہورہی تھی

''بجا'' اور ''حضور'' کہنا اچھن صاحب کے مزاج کے برخلاف تھا۔ مغرب کی آزادانہ فضا نے ان کو درباری آداب اور کورنش بجالانے سے پرے رکھا تھا۔ اس مضمون کے چند جملے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے: ''اچھن صاحب کی یہ مختصر زندگی کتنی گوناگوں، کتنی دلچسپ، کتنی پرعبرت اور کتنے متضاد عناصر کو سمیٹے ہوئے تھی ان میں تلون بھی تھا اور استقلال بھی۔ ان کا ذوق بھی بدلتا رہتا تھا اور رفقاء بھی۔ لیکن جس سے جس انداز کا تعلق تھا اس میں کسی بھی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمہ وقت انجمن تھے۔ ان کا حلقہ تعارف نہیں بلکہ دائرہ احباب نہایت وسیع اور گوناگوں تھا اس میں علماء بھی تھے اور مولوی بھی، پنڈت بھی اور سادھو بھی، پروفیسر، ڈاکٹر اور سیاسی بھی۔ حکومت کے اعلی حکام اور عوام کے لیڈر بازاری اور خواص میں سب ان کے عزیز دوست تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں جو شخصیتیں ابھر کر آئیں ان میں سے اکثر سے ان کے تعلقات تھے اور بہت مخلصانہ''۔ ایک جگہ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''نوکروں چاکروں میں جس طرح خوش رہتے تھے بغیر پیش خدمت دوستوں کو اپنے ہاتھ سے چلمیں بھر کر پیش کرنے میں بھی انہیں وہی انبساط ہوتا تھا''۔ غرض کہ اچھن صاحب کی عظمت و کردار کا ہر پہلو اتنی وضاحت، محبت اور خلوص سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بھی واجد علی اشک سے عشق وعقیدت ہوجائے۔ آخر میں ان کی چند غزلیں اور منتخب اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

مولانا عبدالسلام خاں نے ''افکار اقبال'' میں علامہ اقبال کی شخصیت کے، سوانح نگار کی حیثیت سے وہ پہلو بھی بیان کیے ہیں جو عام قاری کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے۔ اس لیے کہ علامہ کی امیج ''حکیم الامت'' اور ''شاعر اسلام'' کے طور پر اجاگر ہوکر ذہنوں پر ایسی چھائی ہے جس میں کمی یا کجی کی گنجائش بھی محال ہے۔ مثلاً یہ کہ علامہ قادیانیت اور اس کے بانی کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو مشن اسکول سے اٹھا کر قادیان کے تعلیم الاسلام نام کے اسکول میں داخل کرادیا۔ یا علامہ کسی امتحان میں فیل بھی ہوچکے تھے یا اپنی پہلی بیوی سے عمر اور معیار کے فرق کی بناء پر ازدواجی تعلقات خوش گوار نہ رکھ سکے وغیرہ۔ کسی شخصیت کے لیے جو خیر سے بین الاقوامی قدر ومنزلت اور لوگوں کی جذباتی عقیدت کی حامل ہو، توصیفی جملے ادا کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے سبھی کر لیتے ہیں۔ سوانح نگار کی دیانت داری یہی ہے کہ سیرت وکردار کے ہر سیاہ وسفید پہلو پر روشنی ڈالے۔ یہی مولانا عبدالسلام خاں کی شخصیت نگاری کا وصف ہے یہ سب لکھتے لکھتے ایک

جملہ ایسافی البدیہہ لکھا کہ طبیعت کو بڑی فرحت بخشتا ہے ''یہ اقبال کی خوش بختی اور ملک کی خوش نصیبی تھی کہ اقبال پی ایل اے میں فیل ہوئے اور مقابلہ کے لیے نا اہل ثابت ہوئے۔ ورنہ اقبال سب کچھ ہوجاتے لیکن اقبال نہ ہوتے''بس اسی جملہ میں اقبال کی اقبالیت ''حکیم الامت'' کی دانائی وحکمت، علامہ کی علامیت یا ''شاعر اسلام'' کی مذہبی جذباتیت مضمر ہے اور یہیں سے علامہ کے لیے عقیدت کے ابواب وا ہوتے ہیں۔ اقبال کا پورا فلسفہ، تخیلاتی سفر کا تسلسل، شاعری اور شعریت کی موشگافیاں ہوتی ہیں۔ صوفی ازم کا پس منظر اور روحانیت آشکار ہوتی ہے۔ اقبال کی مابعد الطبیعاتی فکر کی تشریح ہوتی ہے۔ سماجی وسیاسی فکر اور ملت کے غم کا سوز دروں عیاں ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی میں دین کی اہمیت، خودی کا فلسفیانہ تصور، جمہوریت وآمریت کی خلیج اور اشتراکیت کا رجحان، برصغیر ہندوستان کے سادھوسنتوں، ولی اولیاء اور مشرق ومغرب بلکہ دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں کی تحریروں کا عمیق مطالعہ اور اس کے نتیجہ میں اقبال کا فکری تغیر اور سفر وغیرہ سب کچھ بقدر فہم سامنے آتا ہے۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ اقبال کے ہاں عشق کے کائناتی تصور میں جذباتیت کا شمول بعد کا اضافہ ہے تاہم یہ جذبہ عشق اپنے حقیقی اعتبار میں جنسی کشش سے الگ ہی رہا بلکہ الگ کردیا گیا اور اس طرح جذبہ کی روحانیت اور تقدس کو محفوظ کردیا گیا۔ یہ متصوفانہ جذبۂ عشق ہے۔ اقبال نے ذات باری تعالیٰ میں فنا ہوجانے کی متصوفانہ خواہش کو الگ کرکے اپنی خودی کو نمایاں کرنے اور نظام عالم کو سنوارنے کو جد وجہد کا نقطہ آغاز بنایا۔ عقلی رکاوٹوں کو عشق کی جذباتی جرأتوں سے دور کردینے کا پیغام دیا۔

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

خدا کے اقتدار مطلق پر یقین رکھے بغیر کوئی فرد مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ہر اقتدار کی شرط اطاعت ہی ہے۔

مسلمانے کہ داند رمز دیں را نساید پیش غیر اللہ جبیں را

اقبال کے ذہنی ارتقاء، ژرف نگاہی، باطنی فکر اور اس کے تغیرات کا مولانا نے جیسا تجزیہ کیا ہے شاید ہی کوئی ناقد یا مبصر ایسی نگاہ رکھتا ہو فرماتے ہیں کہ اقبال مسلمان کو ''فقط وعدۂ حور'' سے جھنجھلا جاتے تھے اور نا کہنی بھی اپنی شاعرانہ رو میں کہہ گزرتے تھے۔ مسلمان کی مفلسی، فقر وفاقہ اور اس کے

نتیجہ میں معیار کی پستی سے بھی ملول ہوتے تھے۔

مریدے فاقہ مست گفت با شیخ	کہ یزداں را زحال ما خبر نیست
بما نزدیک از شہ رگ ماست	ولیکن از شکم نزدیک تر نیست

بایں ہمہ اقبال رجائیت پسند تھے اور ''از ماست انچہ بر ماست'' سے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔ انہیں اپنے نفس گرم پر بھروسہ اور ملت کی خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کے بھڑک اٹھنے پر اعتماد تھا۔ ان کی چشم بصیرت ملت اسلامی کی تقدیر دیکھ رہی تھی وہ اس کی مٹی کی زرخیزی جانتے تھے۔ فقط اس کی نمنا کی کے منتظر تھے۔ مشہور مصرعہ کے مصداق ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'' یا

راز اس آتش نوائی کا مرے سینہ میں دیکھ	جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینہ میں دیکھ
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز	اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

مولانا نے بہت سے ذیلی عنوان بنا کر اقبال کی شاعری اور آفاقی فکر، گہرائی و گیرائی اور سوز دروں کا ایسا مطالعاتی تجزیہ کیا ہے کہ ہمارے خیال سے کسی بھی اسکالر کو اس موضوع پر ''افکار اقبال'' کے علاوہ کوئی دوسرا ماخذ تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ اقبال دانی، اقبال بینی اور اسکالر کی اپنی اقبال مندی کے لیے بس یہی کافی ہے۔

مولانا عبدالسلام خاں کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے بھی ایک ذہنی لگاؤ اور عقیدت سی تھی۔ ''افکار اقبال'' کا انتساب بھی ان کے نام کرنے کی خواہش تھی لیکن ڈاکٹر صاحب داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ افکار اقبال کا نیا ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے توسط سے شائع ہوا ہے۔ طباعت اگر چہ معیاری نہیں لیکن ملفوظات ارمغاں سے کم نہیں ہیں۔

اردو دنیائے ادب میں مولانا روم کے باقاعدہ تعارف کا سہرا علامہ اقبال کو جاتا ہے۔ اس کا اعتراف اردو ادب کی ایک عظیم اور قد آور شخصیت جناب مالک رام نے ''افکار رومی'' کے تعارف میں کیا ہے۔ عربی و فارسی میں مولانا روم کی تمام منظوم و منثور تصانیف میں اہم ترین ''مثنوی معنوی'' ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت جتانے کے لیے کسی نے منظوم تعریف یوں کی ہے۔

مثنوئ مولوئ معنوی	ہست قرآں در زبان پہلوی
من نمی گویم کہ آں عالی جناب	ہست پیغمبر ولے دارد کتاب

مذکورہ اشعار کے پہلے شعر سے ہی جناب مالک رام نے "افکار رومی" کے مقدمہ کا آغاز کیا ہے۔علامہ شبلی کی تصنیف "سوانح مولانا روم" اور قاری تلمذ حسین کی "صاحب المثنوی" کے مندرجات اور حوالوں کے ساتھ مولانا عبدالسلام خاں کے اس کارنامہ کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ بتایا ہے۔وہ تحریر فرماتے ہیں "مولانا عبدالسلام خاں نے مثنوی کا مطالعہ ایک نئے زاویہ سے کیا ہے وہ جن نتائج پر پہنچے ہیں ان میں سے بعض بہت اہم ہیں اور ان سے مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے"۔

"اقبال نے اپنے کلام میں مولوی روم کو برملا اپنا رہبر اور گرو تسلیم کیا ہے۔اور جاوید نامہ کو سراسر ان ہی کی معیت کا نتیجہ قرار دیا" رومی کی معنویت میں اقبال کی بدولت بہت وسعت پیدا ہوگئی۔ مالک رام صاحب کے بقول مولانا عبدالسلام خاں نے ثابت کیا ہے کہ مولوی روم پوری کائنات کی عام زندگی کے قائل ہیں۔

مولوی عبدالسلام خاں نے مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی تصنیف "تاریخ دعوت وعزیمت" میں مذکور فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش اور علامہ شبلی نعمانی کی "سوانح مولانا روم" کے علاوہ بدیع الزماں فروزاں تہران یونیورسٹی کے پروفیسر کے "رسالہ در تحقیق احوال وزندگانی مولانا جلال الدین محمد"، "نفحات الانس"، "مقالہ قونیہ"، "مناقب العارفین" اور "رسالہ سپہ سالار" وغیرہ دیگر مآخذ سے صرف استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ سارے حوالہ جات بھی تحریر کیے ہیں۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب نے مولانا روم کے متنوع حالات اور تغیر پذیر خیالات، ان سے عوام وخواص کی بددلی ومنافرت کے بعد پھر انس وعقیدت کا بڑا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔مولانا روم کا شمس تبریز سے والہانہ عشق، ہجر وفراق کا سوز اس انداز سے بیان کیا ہے جس سے ہمارا جیسا قاری ایک عجیب سے تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔شریعت وطریقت کا اختلاف اور امتزاج، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی باریکیاں، فنافی الذات فنافی الشیخ اور فنافی اللہ ہوجانے کے تصوف کے مدارج سے ابہام بھی پیدا ہوتا ہے اور آخرش خانقاہی وصوفیانہ فلسفہ کے مقلدین، پیرومرشد کو رہنما اور نجات دہندہ سمجھنے والے رہروان شوق کی خوش عقیدگی ظہور پذیر ہوتی ہے۔مولانا روم کے جنازہ میں باجے تاشے، ناچ گانا اور قوالیوں کے ساتھ تکبیر وتہلیل، خلق خدا کا اژدہام ایسا کہ جنازہ کا تابوت چھ بار ٹوٹا اور بدلا گیا۔وصیت کے مطابق جنازہ کی نماز شیخ صدرالدین کو پڑھانا تھی لیکن وہ چیخ مار کر بے ہوش

ہوگئے اور قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی۔ اپنے والد محمد بہاء الدین سلطان العلماء کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ چالیس دن مسلسل لوگوں کی آمدورفت، قبر کی زیارت، فاتحہ خوانی کے ساتھ مرثیہ خوانی کا تذکرہ عجیب اور ناقابل فہم سماں پیدا کرتا ہے۔ بہرحال یہ سب حقیقی واقعات اہل طریقت اور سالکین پر وجد کی کیفیت طاری کرتے ہوں گے ہمیں نہیں معلوم کہ خود مولانا عبدالسلام خاں کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی یا مرحوم کی خوش عقیدگی میں کچھ اضافہ ہوا ہوگا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جس کتاب کو قرآن کا درجہ دیا گیا اور صاحب کتاب کی تعظیم وتکریم پرستش کی حد تک پہنچ گئی، اس نگارش کے تمام محرکات، عوامل وعواقب، زمانی پس منظر عوام کا ذہنی معیار اور خود مصنف کا فکری تغیر وتنوع سب کچھ سامنے لائے بغیر مثنوی کی محض کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ ان تمام حالات کے مطالعہ سے ایک عام قاری، بڑا قرین قیاس لگتا ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ قادیانیت جیسی کسی تبدیلی کی داغ بیل تو ساتویں صدی ہجری میں قونیہ میں ہی پڑ چکی تھی۔ غلام احمد قادیانی نے دو قدم آگے بڑھ کر دعویٰ نبوت بھی کرڈالا لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ عقائد اور نظریات کا تضاد ہی زندگی کا حسن ہے مگر شرط یہ ہے کہ الہامی دین اسلام اور شریعت مطہرہ محفوظ رہے۔ کلمہ طیبہ کے دونوں حصے مساوی طور پر لازم ہیں۔ بہرحال فلسفۂ تصوف کو سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ ہم بھی ان ہی ناکسوں میں ہیں۔ علامہ شبلی نے مثنوی کو تصوف کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ عقائد اور علم الکلام کی کتاب کی حیثیت سے دیکھا مگر ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے مولانا کی ان تحریروں کو تصوف کے موضوع پر حرف آخر بتایا ہے اور حیرت کا اظہار بھی کیا کہ صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی مولانا عبدالسلام خاں نے صوفی ازم پر ایسا شاہکار پیش کیا۔

حقیقتاً مولانا روم کی مثنوی کا اصل موضوع تصوف اور سلوک ہے۔ اس کے مضامین اپنی کثرت اور تنوع کے باوجود اسی محور پر گھومتے ہیں۔ انتشار اور بے ترتیبی کے ہوتے ہوئے بھی ابتدائے طلب سے استغراق وصحو تک سب احوال ومقامات، منازل ومراحل موجود ہیں اور ہر ایک کی مناسبت سے رشد وہدایات۔

''افکار رومی'' میں تصوف کی اصطلاحات کا استعمال خوب کیا گیا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کے اشعار اور بزبان عربی تمام شذرات وفرمودات اصلاً نقل کیے گئے ہیں تاہم زبان وبیان ادق نہیں ہے۔

جناب مالک رام کے علاوہ اردو ادب کے بلند پایہ محققین اور صائب الرائے دانشوروں کے

مولانا کی نگارشات پر تبصرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

نثار احمد فاروقی مولانا عبدالسلام خاں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں ”جیسے انہوں نے اسلامی علوم عقلیہ (تفسیر، حدیث، تاریخ) کے قدیم سرمایہ کو گہری نظر سے پڑھا، اسی طرح انہوں نے ہندوستانی فلسفہ، یونانی فلسفہ اور مغربی فلسفہ میں بھی گہری دست رس حاصل کی“۔ان کی نوک قلم سے اردو کے علاوہ عربی، انگریزی زبانوں میں اہم ترین مقالات منظر عام پر آئے۔انہوں نے جلال الدین رومی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شاعر مشرق علامہ اقبال کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے حالات زندگی اور افکار پر مستقل کتابیں لکھیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ڈائرکٹر شپ کے زمانہ میں لائبریری کے اشاعتی شعبہ سے مولانا کی متعدد کتابیں شائع کیں۔جن میں پروفیسر فدا علی خاں کی ”قواعد اردو“ کی تدوین اہم ترین ہے۔خدا بخش کے سالانہ خطبات کے طور پر مولانا روم پر ان کے مقالوں کا پہلا ایڈیشن ”افکار رومی“ کے ہی نام سے شائع کیا۔دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ کے توسط سے منظر عام پر آیا۔ مصحفی کا انتخاب دیوان اور مدرسہ پر چار جلدوں کی اشاعت بھی مولانا کے کلیدی مقدمات کے ساتھ شائع کیں۔غالباً بیدار صاحب کو ہم وطن بزرگ عالم کے ساتھ رضا لائبریری رام پور میں بھی کام کرنے کا موقع ملا تھا۔وہ ان کی علمی صلاحیتوں کے ساتھ ذاتی و خاندانی اخلاقی صفات سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے بے پناہ انس و عقیدت ہے جو بیدار صاحب کی تحریروں سے مترشح ہے۔مولانا کے برادر بزرگ جامعۃ المعارف کے بانی مولانا عبدالوہاب خاں کے تذکرہ کے ساتھ مولانا کے فرزند اکبر ناصر الدین خاں ایڈوکیٹ کی سعادت مندی اور نیک نیتی کا تذکرہ بھی بڑی محبت سے کیا ہے۔

مولانا کی تمام تالیف و تصانیف کی اہل علم و نظر نے بڑی قدر کی متعدد اکادمیوں سے انعامات بھی ملے جن میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی اسکالر کے طور پر ملا ہوا تاحیات پچاس ہزار روپے سالانہ کا انعام بھی شامل ہے اور عربی فارسی اردو اور فلسفہ کے اسکالر کے طور پر نواب فیض اللہ خاں ایوارڈ رام پور رضا لائبریری نے بھی دیا۔مولانا نے کچھ عرصہ تک اپنے رفیق دیرینہ اور ہم زلف مولانا امتیاز عرشی صاحب کے ساتھ رضا لائبریری میں مخطوطات پر بھی بڑا کام کیا۔اس طرح مولانا عرشی کی دوستی اور قرابت داری میں مولانا عبدالسلام خاں علم و ادب کے عرش نشیں نظر آتے ہیں۔

رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ایک نادر عربی مخطوطہ ”شرح الکافیہ“

ڈاکٹر تبسم صابر

تحقیق و جستجو کی راہ میں رام پور رضا لائبریری میل کا پتھر ثابت ہو چکی ہے۔ یہ لائبریری اپنے اندر لاتعداد نوادر کے خزانے کو محفوظ کیے ہوئے ہے جس کی اہمیت سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اسی لیے ہر زمانے میں دور دراز کا سفر طے کر کے اصحاب قلم یہاں پہنچتے اور کسب فنون کے جواہر اپنے دامنوں میں بھر کر شاداں و فرحاں واپس ہوئے۔

پیش نظر مقالے میں رام پور رضا لائبریری میں موجود ایک عربی مخطوطہ ”شرح الکافیہ“ کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ اس کے مصنف سید رضی الدین نجم الائمہ محمد بن الحسن الاسترابادی (۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء) ہیں۔ یہ مخطوطہ کئی اعتبار سے ندرت کا حامل ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی ندرتوں کا ذکر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب اور شرح دونوں کا مختصر تعارف پیش کریں۔

”شرح الکافیہ“ ساتویں صدی ہجری کے مشہور عالم جمال الدین ابو عمر عثمان بن الحاجب المالکی (ف ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۸ء) کی کتاب ”الکافیہ فی النحو“ کی شرح ہے۔ ابن حاجب نے علم الفقہ، علم العروض اور علم النحو وغیرہ میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ لیکن انہیں خاص شہرت علم النحو کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ الکافیہ علم النحو کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک اہم اور جامع کتاب کے طور پر جانی جاتی ہے۔ جس کی متعدد شرحیں، حواشی اور تعلیقات ہیں۔ درس نظامی کے نصاب تعلیم میں یہ کتاب شامل ہے اور دارالعلوم

کیٹلاگر رام پور رضا لائبریری، رام پور۔ tabassumsabiralig@gmail.com(Mob.9897483070)

دیو بند وغیرہ مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔رام پور رضا لائبریری میں اس کتاب کے ۱۳ قلمی نسخے ہیں۔ جب کہ شرح الکافیہ زیر بحث کتاب کے ۵ قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ تمام نسخے فن نحو، موجودات نمبر ۴۸۱۹ سے ۴۸۳۴ تک کے تحت دیکھے جا سکتے ہیں۔ زیر بحث شرح کے علاوہ اور بھی شرحیں ہیں لیکن ان تمام شرحوں میں سید رضی الدین نجم الائمہ محمد بن الحسن الاستر ابادی (۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء) کی یہ شرح اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں شارح نے ابن الحاجب کے کلام کی وضاحت نہایت جامع، مدلل اور قدرے تفصیلی انداز سے کی ہے نیز شرح کرتے وقت جا بجا قرآن کی آیات مقدسہ، احادیث مبارکہ اور اشعار عرب کو شواہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ سید رضی الدین نے اس کتاب کی تکمیل مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر حاضری کے دوران ۶۸۶ھ میں کی ہے۔

رام پور رضا لائبریری میں محفوظ اس کے ۵ قلمی نسخوں میں ایک نسخہ موجودات نمبر "۴۸۳۲" اس لحاظ سے خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ اس کے عنوانی صفحے پر مغل سلاطین و امراء کی گیارہ قیمتی مہریں اور یادداشتیں ثبت ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں نے اسے دیکھا اور مطالعہ کیا ہے اور یہ ان کا تصدیق شدہ یعنی ویری فیکیشن کیا ہوا نسخہ ہے۔ اس نسخہ کی قدر و قیمت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ شاہ جہانی بادشاہ کے وزیر خاص سعد اللہ خاں نے کتابت کی ہے اور اس پر جا بجا اپنے حواشی تحریر کیے ہیں۔

مخطوطے کا سائز 28.5x17 سینٹی میٹر ہے۔ صفحہ اول پر نہایت خوبصورت سونے کی لوح ہے۔ مخطوطے کے ہر صفحہ پر متن سنہری بارڈر میں خوش خط لکھا ہوا ہے۔ فی صفحہ ۲۵ سطریں ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں سرخ روشنائی سے جلی عبارتیں تحریر ہیں۔ صفحہ عنوان سے قبل مولانا امتیاز علی عرشی سابق کیٹلاگر رام پور رضا لائبریری نے انگریزی زبان میں یہ نوٹ چسپاں کیا ہے کہ اس نسخہ کی اہمیت پر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے جرنل شمارہ نمبر ۱۳، سنہ اشاعت ۱۹۷۰ء میں انہوں نے مولوی حافظ نذیر احمد کا ایک اہم مضمون دیکھا ہے۔

مولانا عرشی نے جس مضمون کی نشان دہی کی ہے گو کہ میری رسائی اس مضمون تک نہیں ہو سکی ہے لیکن بعض ندرتیں جو اپنی کم علمی کے باوصف مجھ پر ظاہر ہو گئیں وہ اس مخطوطے پر ثبت قیمتی مہریں اور یادداشتیں اور اس کا ایک مغل بادشاہ کے وزیر کے ہاتھوں کتابت کیا ہوا ہونا ہے۔ آیئے اب ذرا تفصیل

سے مخطوطہ کے عنوانی صفحہ پر موجود مغل سلاطین وامراء کی گیارہ مہروں اور یادداشتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔اس میں سب سے اوپر دائیں جانب جلی قلم سے لکھی ہوئی شاہ جہاں بادشاہ کی حسب ذیل طویل تحریر ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ایں کتاب شرح رضی الدین وحاشیہ آں شرح خط سعد اللہ خاں مرحوم ومغفور است در غرۂ شہر رجب المرجب داخل کتاب خانۂ ایں نیاز مند درگاہ شد۔حرّرہ شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ"۔	یہ کتاب شرح رضی الدین اور اس کی شرح وحاشیہ سعد اللہ خاں مرحوم ومغفور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور ابتدا ماہ رجب المرجب کو یہ کتاب اس نیاز مند کے کتاب خانے میں داخل ہوئی، تحریر کیا اس کو شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ نے۔

۲۔اس کے نیچے تاج الاسلام ابوسعد عبدالکریم بن محمد بن منصور تمیمی سمعانی کی معروف ترین کتاب "الانساب" سے علم نحو کی ابتداء سے متعلق ایک عبارت رقم ہے جس کے نیچے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کی مہر ہے "ابوالمظفر محمد محی الدین عالم گیر بادشاہ سنہ احد"۔

جس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ "سمعانی" کی کتاب سے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے اسے نقل کیا ہے اور یہ مہر اس کی تخت نشینی کے پہلے سال میں لگائی گئی ہے۔

۳۔شاہ جہاں کی تحریر کردہ عبارت کے بالکل سامنے صفحہ پر اوپر کی طرف بائیں جانب شاہ جہاں کے وزیر خاص سعد اللہ خاں کی مہر ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے:

"سعد اللہ خان مرید حضرت شاہجہان ۱۰۵۴ھ"۔

۴،۵۔اس کے بعد درمیانی صفحہ پر اٹھارہویں صدی عیسوی میں عربی کے مشہور ومعروف ہندوستانی شاعر وادیب غلام علی آزاد بلگرامی ۱۷۸۶ء کی یہ تحریر ہے:

"بتاریخ بست وہفتم ربیع الاول ۱۱۵۵ھ عرض دیدہ شد، من عواری الزمان ابی الفقیر غلام علی المتخلص بہ آزاد الحسینی البلگرامی عاملہ اللہ بلطفہ السامی ۱۱۶۹ھ"۔	۲۷/ربیع الاول ۱۱۵۵ھ کو یہ مخطوطہ دیکھ لیا گیا۔ زمانے کے سب سے گنہگار ابوالفقیر غلام علی جن کا تخلص آزاد ہے حسینی واسطی بلگرامی۔اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے عظیم لطف وکرم کا معاملہ فرمائے۔

مذکورہ بالاتحریر کے ساتھ آزاد بلگرامی کی دومہریں بھی ہیں جن پرفقیر آزاد ۱۲۶۸ھ کندہ ہے۔

۶۔اس کے بعد چوتھے نمبر پرمحمد سعداللہ کی مہر ہے۔جس پر نام کے ساتھ ۱۲۴۹ھ صاف واضح ہے۔اس مہر کے اوپر یہ عربی عبارت درج ہے:

قد ساقه التقدير الى هٰذا الفقير ابی محمد الشهير بسعد الله الحسن معناه وحسبی اللّٰه قول الناس فيما ملكته لقد ظاهره اعلان ۱۲۶۹ھ۔	قسمت نے اس مخطوطے کواس بندۂ فقیر کے ہاتھوں تک پہنچایا جس کی شہرت سعداللہ سے ہے جس کے اچھے معنی ہیں اور میرے لیے اپنی ملکیت کے بارے میں لوگوں کا یہ قول کافی ہے کہ (آگے دولفظ غیرواضح ہیں)۔یہ عبارت ۱۲۶۹ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

اس مہراورعبارت کو دیکھ کر پہلی بار میں یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر محمد سعداللہ خان کی ہوگی لیکن اس کے مہر میں موجود ۱۲۴۹ھ اور تحریر کے ساتھ رقم ۱۲۶۹ھ سنہ دیکھ کر یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی اور محمد سعداللہ ہیں۔میری تحقیق یہ ہے کہ مفتی محمد سعداللہ مرادآبادی کی مہر ہے اس لیے کہ میں نے یہ مہر اکثر ان کی کتابوں پر لگی دیکھی ہے اوران کا کتب خانہ نواب کلب علی خاں کے زمانے میں رام پور رضا لائبریری میں منتقل ہوگیا تھا اس میں بھی اکثر کتابوں پر یہ مہر ثبت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۷۔اس کے بعد پانچویں نمبر پر شاہ جہاں کے خاص مشیر صالح خاں کی مہر ''فقیر بندہ صالح خاں مرید شاہجہاں'' کہ ہے جس کے نیچے یہ تصدیقی عبارت لکھی ہے''عرض دیدہ شد بفضل تمام'' یعنی ''تصدیق کی جاتی ہے کہ اس کو مکمل طور پر دیکھ لیا گیا''۔یعنی اس پر بادشاہ نے مکمل طور پر اپنی نظر ڈال لی ہے۔

۸۔چھٹے نمبر پر اعتماد خاں کی مہر''اعتماد خاں بندۂ شاہجہاں ۱۰۶۳ھ'' مع تصدیقی عبارت درج ہے۔

۹۔اس کے بائیں جانب ساتویں مہر''فاضل خاں بندۂ شاہجہاں ۱۰۵۱ھ'' ثبت ہے جس کے ساتھ یہ تصدیقی عبارت لکھی ہے:

علی حسب الحکم عرض دیدہ شد۔ شاہی حکم پراس مخطوطے کواچھی طرح دیکھ لیا

اللہ اکبـــر۔ گیا ہے۔اللہ بہت بڑا ہے۔

۱۰۔آٹھویں نمبر پر سب سے نیچے عنایت خاں کی مہر ہے: ''عنایت خاں شاہجہانی ۱۳۱'' اس کے نیچے تحریر ہے:

شانزدہم ربیع الاول ۳۱ جلوس عرض دیدہ شد خانزادۂ درگاہ عنایت اللہ۔

یہ مخطوطہ شاہ جہاں بادشاہ کی تخت نشینی کے ۱۳۱ویں سال میری نظر سے گزرا۔

۱۱۔نویں مہر صفحہ کے درمیان میں بائیں طرف ''مرشد علی خان کی ۱۰۵۴ یا ۱۱۵۴'' ہے۔

علاوہ ازیں صفحے کے دائیں نیچے کونے میں کچھ اس طرح کی عبارت ہے جو صاف نہیں ہے۔ ''نصاب نحو، خواجہ بلال جماعت عالمگیری؟''۔

صفحہ عنوان پر ثبت ان مذکورہ مہروں کے علاوہ مخطوطہ کے آخر میں ترقیمہ کی عبارت جس میں مصنف یا کاتب اپنے اور کتاب کے نام اور سنہ کتابت کی وضاحت کرتے ہیں۔اس میں مخطوطے کا سنہ کتابت ۱۰۵۰ھ لکھا ہے۔البتہ کاتب کا نام نہیں ہے اور یہ بات کہ اس کے کاتب شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر خاص محمد سعد اللہ خاں ہیں اور ان کے انتقال کے بعد شاہ جہاں نے اسے اپنے کتب خانہ میں داخل کر لیا تھا، صفحہ عنوان پر موجود شاہ جہاں کے نوٹ سے معلوم ہوتی ہے۔

مخطوطہ کے اختتام پر ترقیمے سے لگی ہوئی محمد سعد اللہ ۱۲۴۹ھ کی مہر ہے جو صفحہ عنوان پر بھی ملتی ہے۔

غرض یہ مخطوطہ زبان حال سے مغل بادشاہوں کی علم دوستی اور کتب بینی کا شاہد ہے اور اپنی انہیں گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے رام پور رضا لائبریری کے نوادرات میں شامل ہے۔

افغانستان کے علمی اور تہذیبی حالات
تحقیقی و تنقیدی جائزہ

پروفیسر حسن بیگ*

تعارف: جنوبی ایشیا کے مغربی کنارے پر واقع افغانستان، قدیم اور جدید تواریخ کے حوالے سے عالمی دلچسپی کا محور رہا ہے۔ اکیسویں صدی کے جدید نقشہ کے مطابق افغانستان کے شمال اور شمال مغرب میں نو آزاد مسلمان ریاستیں، جنوب مغرب میں ایران، مشرق اور جنوب مشرق میں پاکستان، شمال مشرق میں چین اور پاکستان کے علاقے شامل ہیں۔ افغانستان کا عرض بلد شمال سے ۳۴ درجہ ۲۸ منٹ اور طول بلد مشرق سے ۶۹ درجہ اور ۱۱ منٹ ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۵۱۷۷۳ مربع میل یا ۶۵۲۰۹۰۱ مربع کلومیٹر ہے۔(۱)

اکیسویں صدی کے افغانستان کا جدید نقشہ پونے دو ہزار سال کے تاریخی ارتقاء کے بعد وجود میں آیا ہے۔ تاریخ کے اس طویل سفر نے متعدد بار اس کا حلیہ بگاڑا ہے، قوموں کی اندرونی لڑائیوں، بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں اور نئی تہذیبوں کے تعارف نے زمانہ قدیم سے اب تک افغانستان پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس ملک کے جغرافیائی خدوخال سے اس ملک کی سیاسی تاریخ سے آبادی اور بودوباش کو الگ کرنا ناممکن سا دکھائی دیتا ہے۔(۲) لوئس ڈپری کے بقول:

> "Water is the key to the distribution, Proliferation, and perpetuation of animal and plant life, and its absence limits agricultural and pasture land. Four main rivers system exist: Amu Darya, Hari Rud

---

* لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ و عربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ساہیوال کیمپس۔

Hilmand Arghandab, and Kabul." (۳)

کسی بھی خطہ کے منفرد جغرافیائی خدوخال میں دریاؤں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، افغانستان کے بڑے بڑے دریا، سنگلاخ پہاڑی علاقوں سے نکل کر ایک وسیع خطہ میں پھیلتے ہیں۔ بنیادی طور پر افغانستان کے دریائی نظام کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی دریائے آموں، ہری، ہلمند اور دریائے کابل۔

جس طرح افغانستان کی جغرافیائی ساخت میں اختلاف پایا جاتا ہے، اسی طرح اس کے متعدد خطوں کی آب و ہوا میں بے حد اختلاف ہے۔ افغانستان کی جغرافیائی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے لوئس ڈپری یوں رقم طراز ہیں:

"The diverse geographic zones of Afghanistan and disscussed from the point of view of total ecology, emphasizing lines of human contact and communication in reference to zones of accessibility and relative inaccessibility." (۴)

مزید برآں افغانستان کی متضاد آب وہوا نے اس کی نباتاتی اور زراعتی زندگی پر بہت گہرا اثر مرتب کیا ہے۔

The Flora is a reflection of the climatic extremes to which the country is subject. The bitterly cold and snowy winter, the damp raw spring, the excessively summer and dry autumn render afghanistan suitable for a vegetation that mainly annual .... (۵)

شدید سردی اور برفیلا موسم اور شدید گرمی اور بہار وخزاں کے باعث یہاں مختلف خطوں کی نباتاتی اور زرعی پیداوار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

اقتصادی لحاظ سے افغانستان کا شمار دنیا کے غریب ترین ممالک میں ہوتا ہے، ۱۹۷۸ء میں روسی جارحیت اور ۱۱/۹ کی مسلسل خانہ جنگی اور بمباری سے وہ بالکل کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا ہے، جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے افغانستان کی مرکزیت پر سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیرالدین بابر یوں رقم طراز ہیں:

''افغان سرزمین کے کسی بھی مرکز سے ہندوستان پر حملہ کیا جا سکتا ہے،
لیکن یاد رہے کہ شمالی ہند کی مستقل فتح کے لیے کابل کو ہر حال میں محفوظ رکھنا ہوگا۔
کابل ایک ایسا مقام ہے جہاں سے آپ ایک دن میں ایسے مقام پر جا سکتے ہیں
جہاں کبھی برف پگھلتی ہی نہیں اور دو ساعت میں ایسی جگہ پر پہنچ سکتے ہیں جہاں کبھی
برف پڑتی ہی نہیں''۔(۶)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو ملک اب افغانستان کے نام سے معروف ہے، اس کا یہ نام اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوا۔ یعنی جب سے افغان قوم کو ایک مسلمہ سیادت اور وحدت حاصل ہوئی، یہی آج تک اسی کا رسمی اور ملی نام ہے۔ اس سے پہلے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے گردانا جاتا تھا۔ مثلاً دخول اسلام سے پہلے باختریہ، آریانہ اور ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے جب دین اسلام یہاں آیا، تو اٹھارہویں صدی میں یہ ملک ''خراسان'' کے نام سے مشہور رہا اور آج تک، اس کے اس نام کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔(۷)

افغان: سادہ الفاظ میں افغانستان کا مطلب ہے ''افغانوں کی سرزمین''۔ لیکن تاریخ میں لفظ افغان ایک مبہم اصطلاح ہے جس کا کوئی صحیح معنی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ ''مصنف مخزن افغانی'' لفظ افغان کو قرآن پاک میں مذکور ملک طالوت کے پوتے افاغنہ سے جوڑتے ہیں، جو اس قوم کے جدامجد تھے۔(۸) اور ''تاریخ فرشتہ'' کے مصنف لفظ افغان کو فغان یعنی ''غوغا اور فریاد'' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں (۹) بہرحال تاریخ میں لفظ افغان کا ذکر پہلی مرتبہ تیسری صدی میلادی کے ساسانی دور میں ملتا ہے۔(۱۰) اور افغانوں کا قومی نام، پشتون یا پختون اور جمع پشتانہ ہے۔ سر اولف کیرو کے مطابق لفظ پشتون یا پختون کا تعلق دوڈھائی ہزار برس پہلے استعمال ہونے والی اصطلاح پکہت سے جوڑا جا سکتا ہے جس نے بعد میں پشتون یا پختون کی صورت اختیار کر لی۔

نسلی پس منظر: افغان قوم کی اصل نسل کے بارے میں مختلف روایات ہیں، مستشرقین ان کے

نسلی پس منظر کے متعلق مختلف رائے رکھتے ہیں اس لیے کوئی حتمی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے، اسی طرح افغانی مورخوں میں بھی یہ مسئلہ بڑی بحث کا شکار رہا ہے۔ سر اولف کیرو کے بقول:

"Some of them withdrew to the mountain of Ghor - the modern Hazarajat - and some of them to the neighbourhood of Mecca in Arabia." (۱۱)

زمانہ ماقبل اسلام میں افغان مورخوں میں روایت مشہور ہے کہ افغان قوم بنی اسرائیل کے ان دس گمشدہ قبیلوں کی اولاد ہے جن کو بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کے وقت وہاں سے نکالا تھا۔ ان میں سے کچھ قبیلوں نے غور کی پہاڑیوں میں پناہ لی جو آج کل ہزارہ جات کہلاتے ہیں اور کچھ عرب میں جا بسے۔ ان قبیلوں کے جدامجد افاغنہ تھے اور اسی وجہ سے افغان کے نام سے مشہور ہوئے مصنف ''تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی'' افغانوں کے نسلی پس منظر پر یوں رقم طراز ہیں کہ:

''جب بنی اسرائیل کے بادشاہ حضرت طالوت علیہ السلام (سورۃ البقرہ، آیت ۲۴۷) نے اپنی خواہش پر بنی اسرائیل کے سردار حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا تو ان کے ساتھ بڑی رواداری کے ساتھ پیش آیا اور اپنی سلطنت ان کے حوالے کی۔ اس کے بعد حضرت طالوت حضرت شمائل کی نصیحت کے مطابق اپنے دس فرزندوں کے ہمراہ کفار کے خلاف جہاد پر نکلے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو وصیت کی کہ ''میرے حرم میں دو بیبیاں، جو لاوی بن یعقوب کی نسل سے ہیں۔ تو ان کی حفاظت کرنا، اللہ انہیں اولاد نرینہ عطا کرے گا اور خداوند تعالیٰ اپنی حکمت اور قدرت کاملہ سے ان کے دو لڑکوں کی نسل سے بہت سارے صالح اور پرہیزگاروں کے علاوہ اولیاء اللہ اور اہل حقیقت کو بھی پیدا کرے گا''۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان بیبیوں کی خبرگیری کی، مدت پوری ہونے پر اللہ نے ان دونوں کو دو بیٹے عطا کیے اور داؤد علیہ السلام نے، طالوت کی وصیت کے مطابق ایک کا نام برخیاء اور دوسرے کا نام ارمیا رکھا۔ دونوں کی خوب سرپرستی فرمانے کے بعد ہر ایک کو بنی اسرائیل کے ایک ایک گروہ کا سردار مقرر کیا، ان کی محنت ولیاقت سے بنی اسرائیل کو ہر طرح کی

خوشی نصیب ہوئی۔ اللہ نے ہر اک کو ایک ایک لڑکا عطا کیا۔ برخیاء نے اپنے بیٹے کا نام ''آصف'' اور ارمیاء نے اپنے بیٹے کا نام ''افاغنہ'' رکھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے آصف کو وزارتی انتظام اور افاغنہ کو فوج کا سربراہ مقرر کیا۔ افاغنہ کے رعب و دبدبہ سے جن وانس پناہ مانگتے تھے۔ ان کی آل و اولاد ملک شام میں آباد تھی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بخت نصر نے بیت المقدس کو فتح کر کے مسمار و ویران کر دیا۔ بے شمار مردوں خاص کر نوجوان لڑکوں کو قید و بند میں ڈال دیا۔ باقی قوم جو تورات خواں تھی، ان کو وہاں سے نکال کر غور، غزنی، قندھار، کابل اور کوہ فیروز کے پہاڑی علاقوں کی طرف دھکیل دیا، اس طرح افاغنہ کی اولاد نے ایران اور افغانستان میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد بڑھتی گئی اور کثرت سے کافر قبیلوں کے خلاف متواتر جنگیں لڑتی رہی اور اکثر و بیشتر فتح حاصل کر کے کوہستان کا سارا علاقہ زیر نگین کر لیا''۔(۱۲)

سر اولف کیرو مزید رقم طراز ہیں:

"The tradition must be set forth in greater deal. But, lest al-ready the serious reader dismiss it as purefable." (۱۳)

افغان مورخوں کی ان روایات نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگر چہ ایک افسانوی رنگ اختیار کر لیا اور ہوسکتا ہے کہ آج کے سنجیدہ مزاج قارئین اسے محض قصے کہانیاں سمجھ کر مسترد کر دیں۔ لیکن ان روایات کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے اور ان کی حقیقت سے انکار نہیں کی جا سکتا کہ ''افغانیوں کے قبل از تاریخ کے اسلاف اور ان کے خاندانوں کے بارے میں کتنا ہی شک وشبہ کیوں نہ ظاہر کیا جائے لیکن خاندانی شجروں میں ان کا تذکرہ ضرور آتا ہے اور ان شجروں پر قبائلی تقسیم اور داخلی نظام آج بھی منحصر ہے''۔(۱۴)

قیس جو پٹھانوں کے لقب سے مشہور ہے اور جس کا شجرہ نسب پینتالیس واسطوں سے ملک طالوت کے پوتے افاغنہ اور پچپن واسطوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جا پہنچتا ہے(۱۵)۔

حضرت خالد بن ولیدؓ جو خود افاغنہ کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، کی دعوت پر افغانوں کے نمائندوں کے وفد کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپؐ کے لشکر میں شامل ہو کر زبردست شجاعت کا ثبوت دیا اور آپؐ کی دعا و خیر و برکت سے نوازے گئے۔

سر اولف کیرو کے بقول:

"The Prophet lavished all sorts of blessings upon them; and having ascertained the name of each individual, and remarked that Qais was a Hebrew name, whereas they themselves were Arabs, he gave Qais the name of Abdurrashid and observed further to the rest that, they being the posterity of Malik Talut, it was quite proper and just that they should be called Malik likewise . . . and the Prophet predicted that God would make the issue of Qais so numerous that they would outvie all other people, that their attachment to the Faith would in strength be like the wood upon which thay lay the keel when constructing a ship which seamen call Pahtan; on this account he conferred upon Abdurrashid the title of Pathan also."(۱۶)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیس عبرانی کا عبدالرشید نام رکھا اور اولاد کی برکت کے لیے دعا کی اور بطان (۱۷) کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد قیس آپؐ کی اجازت اور دعائیں لے کر رخصت ہوئے اور سارہ دختر خالد بن ولید بن عکرمہؓ سے عقد کر کے غور آ گئے اور دین اسلام کی اشاعت و ترویج میں لگ گئے اور ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (۱۸)

عہد خلافت راشدہ: حضرت عمر فاروقؓ کے عہد مبارک میں خراسان اوراس کے اطراف پر بڑی حکمت عملی سے منصوبہ بندی شروع کی گئی تا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کو رائج کیا جا سکے۔ جب ساسانیوں کی قدیم شہنشاہی کو جڑ سے ختم کیا گیا تو ان کے آخری شہنشاہ یزدگرد نے جلولاء اور نہاوند کی لڑائیوں میں شکست کھانے کے بعد خراسان اور بلخ کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے احنف بن قیس (۱۹) کو خراسان کا جھنڈا عطا کیا اور فرمایا کہ یزدگرد کا تعاقب کرے۔ آپ نے یزدگرد کا تعاقب کیا اور خراسان کو بغیر جنگ کے فتح کرلیا اور حاکم غور کو مرو میں شکست دے کر جیحون کے علاقہ تک پیچھے ہٹا دیا اور باقاعدہ اس کے بعد ان خطوں میں فوجی کاروائیوں کا آغاز کردیا گیا۔ (۲۰)

اس طرح عہد عثمانی میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مزید آگے بڑھا۔ حضرت سیدنا عثمانؓ نے سیدنا عبداللہ بن عامرؓ کو کابل پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا جو ان دنوں سجستان کا علاقہ تھا اور بڑی معرکہ آرائی اور محاصرے کے بعد کابل کو فتح کرلیا گیا۔ (۲۱) مگر اسلامی لشکر کی واپسی ہوتے ہی دوبارہ مقامی حکمرانوں نے اپنی حکومت قائم کی، عہد مرتضوی میں آپؓ نے ۳۶ھ کو عبدالرحمٰن بن جرد الطائی کو سجستان کی طرف بھیجا، تا کہ شورش کو ختم کیا جا سکے اور ۳۹ھ میں حضرت سیدنا علیؓ نے زیاد کو خراسان بھیجا اوران کو امن امان قائم رکھنے اور فتنہ وفساد کے خاتمہ کا حکم فرمایا اور ان کی وساطت سے امن قائم ہوا۔

بنیادی طور پر خراسان کی فتوحات اور دریائے سندھ تک کے مقبوضات کو اسلامی سلطنت میں شامل کرنے کا سہرا عہد خلفائے راشدین کے ابتدائی فاتحین کو حاصل ہے۔ ان فاتحین نے نہ صرف خطوں کو فتح کیا بلکہ خداداد قابلیت کی بدولت سیاسی، علمی تہذیبی نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا اور ایسی پالیسیاں مرتب کیں جنھوں نے آنے والے ادوار میں ایسے اشخاص کو پیدا کیا جنھوں نے بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے اور ایسے ایسے جلیل القدر مفسرین، محدثین، فقہا اور سائنس دانوں کو پیدا کیا کہ علم کی دنیا میں وہ آفتاب بن کر چمکے، جیسے کہ احادیث مبارکہ کی چھ بڑی کتابوں کے مولفین کا تعلق خراسان کے علاقوں سے ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن کے افغانستان پر اثرات: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وادی یثرب کے اوس اور خزرج کے قبائل کے بعد غور کا افغانوں پر مشتمل یہ دوسرا قبیلہ تھا جنھوں نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضری دی اور اجتماعی طور پر اسلام کو قبول کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ افغان قوم ایک

اعلیٰ ظرف اور روشن دماغ قوم ہے اور حقائق کو تسلیم کرتی ہے، جب کسی بات کو اپنی ثقافت سے قریب تر پائے تو اسے قبول کرتی ہے۔ بلاشبہہ اسلام مہمان نوازی، سخاوت، بہادری، رواداری، عزت نفس، تحفظ اور غیرت کے جن اعلیٰ اوصاف کا درس دیتا ہے، وادی غور کے اس افغان وفد نے اس کا مشاہدہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک پرُ اسرار نہیں بلکہ ایک سماجی شخصیت کے طور پر دیکھا اور سمجھا، اس لیے ان کے ذہن اور ضمیر کے دریچے اسلام کی کرنوں سے منور ہو گئے۔ اگرچہ یہودیت، مسیحیت ہندوازم، زرتشت اور بدھ ازم کی یلغار نے خراسان اور بامیان کے میدانوں کو اپنا مسکن بھی بنایا مگر یہ مذاہب افغان قوم کو متاثر نہ کر سکے کیونکہ افغان قوم اوہام پر نہیں عملیت پر یقین رکھتی ہے۔

جب خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی فوجیں خراسان، افغانستان اور اطراف میں داخل ہو رہی تھیں، تو اس وقت اسلام غور کی وادی ہی میں موجود تھا مگر ان فاتحین اسلام نے علمی و عملی صورتوں میں افغانستان کی تہذیب سے دیگر مذاہب باطلہ کے بتوں کو پاش پاش کر کے اسلامی طرز ماحول کو پھیلا دیا اور کابل اور کچھ اطراف کے علاقوں میں یہ مذاہب سمٹ کر رہ گئے اور اسلامی تعلیمات عقائد و افکار کو مقامی دری زبان میں ڈھال دیا گیا، جس سے افغانستان کی ملی وحدت کے استحکام میں روز بروز ترقی آتی گئی۔(۲۲)

علمی و تہذیبی ترقی: اہل عرب کے توسط سے عربی زبان افغان سماج میں ایسے رچ بس گئی کہ آیندہ زمانے سے لے کر اب تک افغانستان نے جتنے بڑے بڑے علماء و فضلاء اور مشائخ پیدا کیے۔ وہ فارسی الاصل، خلجی النسل، ازبک اور پختون النسل ہونے کے باوجود اپنی مادری اور علاقائی زبانوں کی بجائے عربی زبان میں گراں قدر تصانیف چھوڑ گئے، جیسے اصول حدیث میں قاسم بن سلام ہروی (متوفی ۲۲۳ھ) نے کتاب غریب الحدیث لکھی اور عربی زبان میں ہرات کے رہنے والے اس افغان النسل عالم کی کتابوں کی تعداد ایک سو ستّر کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔(۲۳)

ان کے بعد ہرات کے ابوعبیدہ قستانی نے غریب القرآن و غریب الحدیث لکھ کر قرآن و حدیث کے غیر مانوس الفاظ کی وضاحت کی اور مشہور محدث اسحاق بن راہوؔیہ عربی زبان میں المسند فی الحدیث اور تفسیر القرآن کے مصنف تھے۔(۲۴)

اس کے علاوہ تفسیر و احادیث میں مزید جن لوگوں نے کام کیا وہ درج ذیل ہیں:

ابراہیم بن طہمان الہرویؒ، مذاہب السنن فی الفقہ ۔محمد سفریانیؒ، صاحب کتاب التفسیر۔ محمد بن احمد بن حبان البستیؒ، صاحب المسند الصحیح فی الحدیث۔ ابوسلیمان احمد البستیؒ، صاحب معاملہ السنن فی شرح کتاب السنن لابی داؤد۔

اور احمد بن علی المروزی، عمر بن احمد المروزی، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، عبداللہ بن عمان المروزی، حماد بن زید سجستانی (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) زیادہ مشہور اور فقہی میدان میں عبداللہ بن مبارک المروزی، مکحول بن ابی مسلم اور حکم بن عبداللہ البلخی (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) زیادہ معروف ہیں، انھوں نے کتاب فقہ الاکبر کو امام اعظم ابوحنیفہؒ سے روایت کیا اور افغانستان میں فقہ حنفی کو پھیلانے کا سبب بنے۔ مزید براں، بلخ کے علاوہ ہرات، (۲۵) مرو، جوزجان، کابل بست، لغمان، غزنی، خراسان اور نیشاپور نے بڑے بڑے فقہا کو جنم دیا، جنھوں نے افغانستان میں زبردست اسلامی کارنامے سرانجام دیے۔

تصوف جو اسلامی تہذیب و تمدن میں ایک لازمی جز کے طور پر سمجھا جاتا ہے افغانستان اور اس کے لوگوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ افغانستان میں تصوف کو بہت زیادہ پذیرائی ہوئی اور افغانستان میں جن صوفیائے کرام نے اسلامی تصوف کو پروان چڑھایا ان میں بلخ کے تاجور اسحاق بن ابراہیم بن ادھمؒ کا نام سرفہرست ہے۔ جنھوں نے بلخ کی امارت کو چھوڑ کر ریاضت و مجاہدہ اختیار کیا۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر Words Worth اپنی ایک نظم Abu Bin Adam میں ترک امارت و اختیار ریاضت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے میدان میں حضرت مولانا جلال الدین بلخی، شفیق ابن ابراہیم، حاتم لاحمد، احمد بن خضرویہ، بایزید بسطامی، حمدون قصار، غزنی کے حضرت داتا گنج بخش اور حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) زیادہ معروف ہیں۔ ان صوفیائے کرام نے افغانستان میں تصوف کے چراغ کو اس وقت روشن کیا، جب وسطی ایشیاء میں ادب و ثقافت کو زوال آ رہا تھا۔ ان بزرگوں نے اپنی تصنیفات اور عملی کاوشوں سے لوگوں کے قلوب و اذہان کو جلا بخشی۔ (۲۶)

یہ اسلامی نظام کی خوبی تھی کہ افغان قوم استبدادیت، مطلق العنانیت اور استعماریت جیسی لعنتوں سے چھٹکارا پاسکی اور شورائی نظام حکومت اور عادلانہ نظام سے روشناس ہوئی حالانکہ قبل از اسلام آریائی خاندانوں کے عہد میں افغان عوام جبر و ظلم کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور تشدد کی چکی میں

پس رہے تھے۔(۲۷)

احمد شاہ ابدالی اور افغانستان: احمد شاہ ابدالی پشتونوں کے سدوزئی قبیلہ(۲۸) کا سردار اور گورنر ہرات زمان خان ابدالی کا دوسرا بیٹا تھا، جو ۱۱۳۵ھ کو ملتان یا ہرات میں پیدا ہوا۔(۲۹) احمد شاہ ایک زبردست جنگجو کمانڈر تھا، جس نے پانی پت کی لڑائی میں شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کی روزافزوں قوت کو کچل دیا اور افغانستان کی ازسرنو تعمیر کی۔(۳۰)

احمد شاہ مزاجاً مذہبی آدمی تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا ایک متشرع، حنفی مسلک کا قائل، عالم اور دینی احکام پر بڑی دسترس رکھتا تھا۔ کابل سے پشاور جاتے ہوئے شیخ میاں عمر چمکنیؒ (متوفی ۱۱۹۰ھ) کی قیام گاہ پر حاضری اور ہندوستان میں قیام کے دوران حضرت نظام الدین اولیاءؒ، بوعلی قلندرؒ اور دیگر اکابرین کے مزار پر حاضری دیتا۔ مزید براں، احمد شاہ بلند پائے کا شاعر بھی تھا، اس کے پشتو اشعار کا دیوان ''لوئے احمد شاہ بابا'' مشہور افغان مورخ اور ادیب ''عبدالحی حبیبی'' کی وساطت سے ۱۳۱۹ھ میں کابل سے چھپ چکا ہے۔ اس دیوان میں اس کا عشقی، تصوفی، حماسی اور اخلاقی کلام ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اس نے اپنے کلام میں اپنے دور کے نامور صوفی حضرت شاہ فقیر اللہ علوی جلال آبادیؒ اور پشاور چمکنی کے میاں محمد علیؒ سے بہت ارادت وعقیدت ظاہر کی ہے، تصوف میں بھی ان سے بعض ملفوظات منقول ہیں جن پر پشاور کے قاضی مولانا محمد غوثؒ نے ''شرح الشرح'' کے نام سے ادری زبان میں شرح لکھی۔ (۳۱) اس خداداد صفت سے متصف، اس حکمران نے افغان قوم کو غیر ملکی اقتدار سے رہائی دلوا کر آزادی کی دولت سے مالا مال کیا اور ایک لڑی میں پرو دیا۔ افغانستان کو سیاسی وحدت کی منظم شکل دی اور افغانستان کو پہلی مرتبہ آزاد ریاست کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر ابھارنے کا کارنامہ بھی احمد شاہ کے باعث پایہ تکمیل تک پہنچا۔(۳۲)

احمد شاہ ابدالی اپنے دور حکومت میں مذہبی رواداری کی پالیسی پر گامزن رہا اگرچہ احمد شاہ اور اس کے اہل سنت ہم وطن اکثر اوقات خراسان کے بدعقیدہ، ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف برسرپیکار رہے مگر کبھی مذہبی جنون کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ باہم مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دیا۔ سماجی لحاظ سے افغان معاشرے کو اصلاح کے راستہ پر گامزن کیا اور عورتوں کے رتبہ کو بلند کیا، طلاق کو ممنوع اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کی پرزور تحریک شروع کی تاکہ فرسودہ اور باطل نظام کا خاتمہ کیا جاسکے۔(۳۳)

احمد شاہ کا عظیم کارنامہ یہی ہے کہ افغانوں کو ایک قوم بنا دیا اور ایک آزاد وطن بنانے میں جد وجہد کی۔ اگرچہ ان کا وقت جنگی مہمات میں زیادہ گزرا اور تعلیم کی ترقی پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے مگر مورخین کے مطابق افغانستان کے تعلیمی میدان کے لیے زمین ہموار کر گیا اور خود کو ایک علمی مصدر کے طور پر ثابت کیا۔(۳۴) اور دو صدیوں سے زائد گزر جانے کے باوجود افغانوں کے دلوں میں وہ زندہ ہے، جو اسے ''احمد شاہ بابا'' کے نام سے یاد رکھتے ہیں۔ احمد شاہ بابا کا ۲۰/رجب ۱۱۸۶ھ کو انتقال ہوا اور قندھار بر مقام ارک میں دفن کیے گئے، جس کو انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے مدفن کے لیے منتخب کیا تھا۔(۳۵)

امان اللہ خان سے انقلاب ثور تک کے اثرات کا جائزہ: سیاسی لحاظ سے افغانستان کی تاریخ کے مختلف ادوار ہیں۔ ان سیاسی ادوار میں ہونے والی مختلف اصلاحات کا جائزہ لے کر افغانستان کے علمی اور تہذیبی حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۰۱ء کو حبیب اللہ بن عبد الرحمٰن خان امیر افغانستان بنا تو ملک کو بیسوی صدی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدید ملٹری کالج قائم کیے، بڑی اور جدید طرز کی کئی درس گاہیں بنائیں، جن میں حبیبیہ اسکول اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے علاوہ برقی آبی مشین، جدید ترین آلات بجلی کی سپلائی اور جدید طرز تعلیم کے طریقہ کو رائج کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں وائسرائے لارڈ منٹو کے کہنے پر امیر حبیب اللہ جرمنی اور ترکی کے معاملے میں غیر جانب دار رہا اور عوامی انتقام کا شکار ہو گیا، مگر جدید طرز ہائے زندگی کو رائج کرنے میں کامیاب رہا۔(۳۶)

۲۸ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر امان اللہ خان نے باپ کی شہادت کے ساتویں روز سلطنت کو سنبھالا اور از سر نو افغانستان کے علمی اور تہذیبی حالات کو منظم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ امان اللہ فطرتاً افغان قوم کو تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور علمی لحاظ سے ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا تھا اور لوگوں کو قدامت پسندی سے نکال کر ایک نیا شعور اور نئی فکر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں امان افغان کی اخبار کی اشاعت سے افغان تہذیب وتمدن، ادب، تعلیم اور عصری مطبوعات کے مجموعہ کو یکجا کر کے عوام میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی جس سے عوام میں حصول علم کا جذبہ پیدا ہوا اور نئے نئے اسکول اور مدارس کی تاسیس میں لوگ مالی خدمات پیش کرنے لگے۔ ولایت خواست کے لوگوں نے آٹھ لاکھ کی مالی امداد بھی کی۔ اس دور حکومت میں تعلیم نسواں پر بھی زور دیا گیا۔ حکومت مرد وخواتین کو بیرون ممالک اعلیٰ تعلیم

کے لیے بھی بھیج رہی تھی اور کابل، قندھار، خوست، گردیز، زرمت اور لوگر میں اسکولوں کے قیام پر زور دیا جارہا تھا۔(۳۷)

۱۹۲۲ء میں وزیر خارجہ محمود طرزی، جو کہ امیر امان اللہ کا سسر اور خارجی طور پر کمال اتاترک کے نظریات کا حامی تھا، اس کی کاوشوں سے افغانستان اور فرانس کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے کئی افغان طلبہ کو فرانس کی مختلف جامعات بھیجا گیا اور کابل میں نجات کالج (جرمن زبان) اور غازی کالج (انگریزی زبان) کے نام سے خارجی زبانوں میں جامعات بنائے گئے اور حبیبیہ کالج کابل کو علی گڑھ کالج انڈیا کی طرز پر ترقی دے کر ایک نئی راہ پر چلایا۔ اسی طرح غلامی کے قانون کو منسوخ کیا گیا اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے حکمت عملی تیار کر کے مخلوط تعلیم کے اجرا سے پابندی اٹھالی گئی، پریس سے پابندی کا اٹھایا جانا اور کابل سے ارشاد نسواں کے نام سے رسالہ شائع کر کے اعلیٰ تعلیم کے انتظامات بھی اس کے کارناموں میں ہیں۔(۳۸)

اگرچہ ان اصلاحات سے ملک کو کچھ فائدہ بھی ہوا مگر افغانستان چونکہ خالصتاً اسلامی ملک ہے، اس لیے ایسے قوانین کے اجراء سے علماء و مشائخ اور عوام امان اللہ سے بددل ہو گئے اور بغاوت پر اتر آئے، کیونکہ غیروں کی تہذیب کو سینے سے لگا کر اپنے ملک میں اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا افغانستان کے معاشرے میں رجعت پسندانہ تحریکوں کو جنم دینا ہے(۳۹) اور ۱۹۲۸ء کو بلائے گئے، لویہ جرگہ میں علماء و مشائخ کے نظریات کے خلاف اصلاحات اور نبی اکرمؐ کی اہانت سے متعلق معاملہ پر زبردست ردعمل ہوا۔ اس وقت کابل شور بازار کے حضرات (مجددیہ) کے بہت بااثر اور قابل احترام بزرگ حضرت گل آغا اور حضرت معصوم آغا حکومت کے خلاف پورے خراسان کے مفتیان کرام سے فتوے لے کر پکتیا چلے گئے اور زبردست تحریک کا آغاز کر دیا اور حضرت نور المشائخ نے ببانگ دھل اس کو لویہ جرگہ میں کافر قرار دے دیا۔(۴۰) امان اللہ خان نے جتنی قوت سے اس کو دبانے کی کوشش کی اتنی ہی یہ بغاوت بڑھ گئی اور ملا عبدالاحد کوہستانی کی گرفتاری پر تو عام بغاوت پورے افغانستان میں پھیل گئی۔(۴۱) علمائے کرام نے حکومتی نظام نامہ کو غیر اسلامی قرار دے کر امان اللہ کے خلاف لڑنا ایک کافر کے ساتھ لڑنا اور حکومت کے خلاف اب نہیں یا پھر کبھی نہیں اور کرو یا مرو کی بنیاد پر اٹھارہ مطالبات بطور الٹی میٹم کے پیش کر کے اسلامی نظام اور اصطلاحات پیش کر دیں، جس پر حکومت کو اپنے

گھٹنے ٹیکنے پڑے اور تمام اصلاحات جدیدہ کا خاتمہ کیا گیا۔(۴۲)

اس شاہی اعلامیہ پر دیگر علماء ومشائخ کے علاوہ کابل شور بازار کے حضرات (مجددیہ) کے بھی دستخط خصوصی طور پر ثبت تھے۔ یہاں افغانستان کے علمی اور تہذیبی حالات کو بدلنے میں بحث سے مراد یہ مقصود نہیں ہے کہ امان اللہ خان کی اصلاحات جدیدہ خلاف شریعت تھیں یا نہیں بلکہ مورخین کے مطابق اگر امیر مزید دو یا تین سال تک مناسب وقت کا انتظار کرتا اور اصلاحات کے پیش نظر ایک مضبوط عسکری تنظیم کی بنیاد رکھتا جیسے کمال اتاترک نے تجویز کیا تھا تو اصلاحات کے نفاذ میں امیر کو کامیابی ضرور ملتی۔(۴۳)

اسی طرح نادر شاہ کے دور میں افغانستان کے علمی اور تہذیبی اثرات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ نادر شاہ ایک معتدل، خاموش طبع، مدبر اور وطن پرست شخصیت تھا۔ وہ سماجی، اقتصادی اور تعلیمی میدان میں جدید اصطلاحات کا حامی تھا اور تدریجی طور پر تبدیلی لانے کے حق میں تھا اسی لیے مغرب سے دوستی کے باوجود اس نے روس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور ملک کو استحکام بخشا۔ نادر شاہ کی شہادت کے بعد ظاہر شاہ نے ملک کی باگ دوڑ سنبھالی، ظاہر شاہ کا دور افغانستان کی آئینی اور سیاسی تاریخ میں اساسی قانون کا عشرہ کہلاتا ہے اور اس دور میں افغانستان نے سیاسی، اقتصادی، مواصلاتی، تمدنی اور تعلیمی میدان میں خاطر خواہ ترقی کی۔ محمد نادر شاہ کے دور میں میڈیکل کالج، دارالعلوم عربیہ، نادری دارالایتام، موسسہ چارندوی اور فارمیسی کالج کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے علاوہ لیسہ استقلال، نجات حبیبیہ اور دارالعلوم غازی کو از سر نو منظم کر کے کابل میں پہلی بار جامعہ فنون حرب کی بنیاد رکھی۔(۴۴)

ظاہر شاہ کے عہد میں وزارت تعلیم نے لیسہ حبیبیہ، استقلال اور نجات کی آخری جماعتوں کے طلبہ کے لیے سائنسی فیکلٹی کا افتتاح کیا اور اس فیکلٹی کو ریاضی، کیمیا، فزکس اور بیالوجی کے شعبہ جات پر مرتب کیا اور سال ۱۹۳۵ء میں تینتالیس اسکولوں کا افتتاح کیا، ان میں سے کابل اور اس کے مضافات میں انیس، ہرات میں تین، مزار شریف میں چار، قطعن اور بدخشاں میں چھ، مشرقی ولایت میں چھ، جنوبی ولایت میں دو اور میمنہ میں ایک اسکول کا افتتاح کیا گیا۔(۴۵)

۱۹۳۶ء میں افغانستان میں ساٹھ پرائمری اور چھ مڈل اسکول تعمیر کیے گئے اور اسی سال السنہ، حفظان صحت، پوسٹ اور ٹیلی گرام کے شعبوں میں پشتو زبان میں اعلیٰ کورسز کروائے گئے اور انہی شعبوں

سے متعلقہ افراد کو مزید تعلیم کے لیے ترکی بھیجا گیا اور قندھار میں ''لیسہ احمد شاہ بابا'' کا افتتاح کیا گیا اور کابل میں دارالمعلمین کی بنیاد رکھی گئی، اسی سال پشتو ادبی انجمن اور کابل ادبی انجمن کو مدغم کیا گیا اور پشتو ٹولنی کے ناموں سے ادبی کاموں کا آغاز کیا گیا۔ سال ۱۹۳۸ء کو افغانستان کی تعلیمی ترقی میں مزید اضافہ ہوا اور اسی سال پورے ملک میں اٹھہتّر نئے پرائمری اسکول اور مڈل اسکول بنائے گئے نئے اسکولوں کے قیام سے لوگوں میں حصول تعلیم کا شوق بلند ہوا اور حکومت کی توجہ کی وجہ سے اٹھانوے منتخب افراد کو فرانس، جرمنی، امریکہ اور ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔ اسی سال حقوق اور علم سیاسیات کی اکیڈمی کابل کے علاقہ بوستان سرائے میں قائم کی گئی اور سال ۱۹۴۰ء میں آٹھ پرائمری اسکول کابل میں تین قندھار، میں چھ اسکول مشرقی ولایت میں ایک پرائمری اسکول ولایت خوست میں تعمیر کیے گئے اور دو مسلکی اسکول، اسکول ساحت اور اسکول حکام کے نام سے کابل میں شروع کیے گئے اور سال ۱۹۴۱ء میں ملک کے بہت سے پرائمری اسکولوں کو ترقی دے کر انہیں مڈل اسکولوں کا درجہ دے دیا گیا۔ ظاہر شاہ کے دور میں مجموعی طور پر افغانستان میں تعلیمی ترقی کی کوشش کی گئی تھی کہ افغانستان کے لوگ دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بہرہ ور ہو کر یورپی اور غیر ملکی اقوام کے ساتھ علمی طور پر مقابلہ کر سکیں اور جدید علوم وفنون اور ٹیکنالوجی کی طرف راغب ہو سکیں۔ (۴۶)

سردار محمد داؤد خان کا عہد افغانستان میں افراتفری اور شورش کا زمانہ تھا۔ افغانستان کے لوگ اس کو ''لیونے سردار'' یعنی پاگل سردار کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، کیونکہ وہ کم تولنے والے نان بائی کو زندہ جلتے ہوئے تندور میں ڈال چکا تھا۔ ظاہر شاہ کی حکومت کی پالیسیوں کی انعقاد پذیری نے بعد میں خود سردار کے لیے مشکلات پیدا کر دیں اور ان ہی پالیسیوں نے افغانستان کے علمی اور تہذیبی حالات پر زبردست اور گہرے اثرات مرتب کیے۔ حکومتی نااہلی سے ملک کا نظام کمزور ہوتا گیا اور افغانستان عالمی طاقتوں کے نرغے میں آہستہ آہستہ پھنستا چلا گیا۔ اگرچہ روس نے افغانستان کو ہڑپ کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر افغانستان کے علماء ومشائخ اور جہادی اور طلبہ تنظیموں نے اس کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ (۴۷) افغانستان کے اندر اور باہر افغان طلبہ، آزادیٔ افغانستان کی جدوجہد میں اپنے بزرگوں کے شانہ بشانہ رہے اور علماء ومشائخ کمانڈروں کی ہدایات پر کاربند رہے۔ ان تنظیموں میں جبہہ ملی افغانستان، اسلامی جمعیت طلبہ افغانستان، تنظیم طلبہ افغانستان، جمعیت طلبہ حرکت، تنظیم طلبہ سلفیہ،

تنظیم طلبہ اشاعت التوحید و السنہ، ہضہ ملی جوانان افغانستان، اتحاد نوجوان مسلمانان افغانستان، دافغانستان دملک دملی مبارزینو دحوانانو اسلامی گونداور دملگر و مسلمانوں حوانانو ٹولنہ قابل ذکر و معروف ہیں اور اسی قسم کی تنظیمیں اور وحدتیں آسٹریلیا، یورپ، امریکہ اور بھارت میں سرگرم رہ کر افغانستان کی آزادی میں برسر پیکار رہیں۔(۴۸)

مندرجہ بالا بحث سے یہ نمایاں ہوا کہ کس طرح قبل از اسلام سے مابعد اسلام کے دیگر مذاہب اور اسلامی تعلیمات نے افغانستان کی تہذیب وتمدن پر عمیق اثرات مرتب کیے ہیں اور افغانستان کی جغرافیائی صورت حال کس طرح اس کے سیاسی ارتقاء اور افغان معاشرے پر کسی حد تک اثر پذیر ہوئی ہے اور دین اسلام کی سربلندی کو قائم رکھنے کے لیے، سخت سے سخت حالات اور گمبھیر مسائل میں، افغانستان میں اسلامی نفاذ کی کوششیں سرانجام دیں۔

مزید یہ کہ اگرچہ روسی جارحیت اور امریکی ظلم و بربریت نے افغانستان کے عالی تہذیبی اور سماجی ماحول کو متاثر کیا، مگر افغانستان کے لوگوں نے اپنی علمی کاوشوں کو جاری رکھتے ہوئے اس کے سیاسی اور تہذیبی حالات پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ جس کی ایک ہلکی سی جھلک آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ افغانستان کے غیور عوام اپنی تہذیب اور علمی ورثہ کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور نہ گھبراتے ہیں، شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے:

سعدیا روزِ ازل حسن بترکان دادند
زلف باچین و کمرِ نرم بہ ایران دادند
ہنر و فضل و بلاغت ہمہ بامردم ہند
جری و دلیری وعزم بہ افغان دادند (۴۹)

سعدی روز ازل کا حسن اللہ نے ترکوں کو عطا کیا ہے۔ زلفیں اور نرم کمر ایران کے لوگوں کو عطا کی گئی ہے۔ ہنر و فضل اور بلاغت ہندوستان کے لوگوں کو عطا کی گئی ہے اور جرأت مندی، بہادری اور عزم واستقلال افغانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

ایشیاء کے خطہ میں امن کے متلاشی عناصر کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ ایشیا اگر بدن ہے تو افغانستان اس کا دل ہے۔ ایک پرامن ایشیا کا قیام افغانستان میں امن کا مرہون منت ہوسکتا

ہے۔(۵۰) جب تک افغانستان میں امن نہ ہوتو ایشیا کے امن کا سوچنا محض ایک خیال ہے، جیسے شاعر مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا:

آسیا یک پیکر آب و گلِ است
ملت افغان در آن پیکر دل است
از فساد او ، فساد آسیا
در کشاد او ، کشاد آسیا (۵۱)

ایشیا پانی اور مٹی سے ملی ہوئی ایک مملکت جیسی ہے۔ ملت افغان اس مملکت میں دل کی حیثیت رکھتی ہے، جب افغانستان میں فساد ہوگا تو پورے ایشیا میں فساد ہوگا، جب افغانستان میں (آرام وچین) امن ہوگا تو ایشیا میں امن ہوگا۔

حوالہ جات

(۱) G.J,Arez, Geography of Afghanistan, 1970 ,Times Annual, Kabul, p:19

(۲) Tahir Amin, Afghanistan, Crisis, Implications and options for Muslim world, Iran and Pakkistan, 1987,Institute of policy studies Islamabad, p:40

(۳) Lovis Dupree, Afghanistan, 1997,Oxford University press Karachi ,p:33 (۴) Ibid, p:3

(۵) Imperial gazzetter of India, Afghanistan and Nepal, 1999,sang-e-meel, publications, lahore, p:7

(۶) بابر، ظہیرالدین، تزک بابری، کابل: انجمن تاریخ س ن ص: ۴۲۔ (۷) غبار، غلام محمد میر، افغانستان بیک نظر، کابل: پشتو ٹولنہ، ۱۳۲۶ ش ھ، ص: ۲۱۔ (۸) ہروی نعمت اللہ، خواجہ، تاریخ خانجہانی ومخزن افغانی، لکھنو: مکتبہ ندارد، ۱۸۷۶ء، ص: ۳۷۔ (۹) فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، لکھنؤ: مکتبہ ندارد، ۱۳۲۱ھ، ص: ۷۵۔

(۱۰) Sir Olaf Caroe, The Pathans 550B.C-.A.D. 1957,1958,MacmillanCo LTD St Martin's press, New York, p:80 (۱۱) Ibid, p:80

(۱۲) ہروی، نعمت اللہ، خواجہ، تاریخ خانجھانی ومخزن افغانی، ص: ۲۷۔

(۱۳) Sir Olaf Caroe, The Pathans 550B.C-.A.D. 1957,P:3

(۱۴) Mountstuart Elphinstone, an account of Kingdom of caubul, 1972, Oxford University press Karachi,1/218

(۱۵) افغانی، جمال الدین، تتمۃ البیان فی تاریخ فی الافغان، کابل: مکتبہ ندارد، س ن، ص: ۱۷-۱۸۔

(۱۶) Sir Olaf Caroe, The Pathans 550B.C-.A.D. 1957,P:8

(۱۷) لفظ بطان لغت عربی ہے اور فارسی میں اس کے معنی زیرین کے ہیں، اردو میں اس کو پینڈا کہتے ہیں، بطان عربی میں بطن یبطن سے بنا ہوا ہے اور اس کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو نیچے اور پوشیدہ ہوں مثلاً زیر جامہ یعنی جو لباس نیچے پہنا جاتا ہو اور کشتی کا وہ حصہ جو پانی کے نیچے ہوتا ہے اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ جب لفظ بطان عجم میں اور خصوصاً ہند میں پہنچا تو ب، پ سے بدل گئی اور ط، ت ہو گیا اور بعد میں ٹ اور پھر بعد میں پٹھان ہو گیا۔ لغت کے لیے دیکھیے (المنجد عربی اردو، ۱۹۹۴ء دارالاشاعت، کراچی، لفظ بطن)۔ (۱۸) ہروی، نعمت اللہ، خواجہ، تاریخ خانجھانی و مخزن افغانی، ص: ۸۲-۱۱۰ (۱۹) احنف بن قیس بن معاویہ بن معین، ولادت ۳ قبل ہجری آپ کا زمانہ پایا مگر ملاقات نہ کر سکے۔ سیدنا عمرؓ کے دور خلافت میں بصرہ وفد کے ساتھ مدینہ تشریف لائے۔ سیدنا عمرؓ نے انہیں ایک سال تک ٹھہرایا۔ ۷۲ھ کو کوفہ میں وفات پائی۔ (۲۰) ابن الاثیر، علی بن محمد، الشیبانی الجزری، الکامل فی التاریخ، بیروت: دارالمصادر، ۱۹۶۵ء، ۲/ ۵۵۳-۵۵۴ (۲۱) ایضاً، ۳/ ۸۶۔ (۲۲) غبار، غلام محمد میر، افغانستان در مسیر تاریخ، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۳۲۸ ش ھ، ص: ۱۵۴۔ (۲۳) بروکلمان، تاریخ الادب العربی، کابل: مکتبہ ندارد، س ن، ۲/ ۱۵۵۔ (۲۴) عبدالحئی حبیبی، علامہ، تاریخ افغانستان بعد از اسلام، کابل: نشر کردہ، انجمن تاریخ، ۱۳۴۵ ش ھ، ص: ۳۷۷۔ (۲۵) ایضاً، ص ۷۷۹۔ (۲۶) غبار، غلام محمد میر، افغانستان در مسیر تاریخ، ص: ۱۷۵۔ (۲۷) نجیب اللہ، آریانا افغانستان، پشاور: ڈھکی نعل بندی، قصہ خوانی، ۱۳۷۹ھ، ص: ۹۵۔ (۲۸) عبدالحئی حبیبی، علامہ، تاریخ مختصر افغانستان، کابل: مکتبہ ندارد، س ن، ۱۳۴۶ ش ھ، ص: ۲۵۷۔ (۲۹) رحمت خان، حافظ، خلاصۃ الانساب، (مع پشتو ترجمہ، مترجم: محمد نواز طائر)، پشاور: پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء، ص: ۸۷۔ (۳۰) غبار، غلام محمد میر، احمد شاہ بابائے افغان، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۹۴۴ء، ص: ۲۵۔

(۳۱) Mountstuart Elphinstone, an account of Kingdom of caubul, Vol:1, p

298-299

(۳۲)سنگھ، گنڈا، احمد شاہ ابدالی، لاہور: مکتبہ تخلیقات لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۳۶۶-۳۶۷۔(۳۳) سلطان قندھاری، خالص، تاریخ سلطانی، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۲۹۸ھ، ص: ۲۶۹۔(۳۴) کامگار، جمیل الرحمان، دکتر، دافغانستان دمعارف تاریخ، (مترجم: قاری عبدالسمیع شہزاد)، کابل: میوند خپر ندوے ٹولنی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۱۔(۳۵) عبدالحئی حبیبی، علامہ، دافغانستان لنڈ تاریخ، قندھار: علامہ رشاد خپر ندویہ ٹولنہ، ۱۳۹۱ ش ھ، ۲/ ۳۶۹-۳۷۹۔(۳۶) عبدالحئی حبیبی، علامہ، پشتو ادبیات تاریخ، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۹۵۰ء، ص: ۲۳۵۔

(۳۷) Nighat Mehroze Chishti,Constitutional Development in Afghanistan, 1998 ,Royal Book Company,Karachi,p:22-23

(۳۸) ابراہیم عطائی، دافغانستان پر معاصر یوہ لنڈ کتنہ، پشاور: سبا کتاب قصہ خوانی، ۱۳۸۰ ش ھ، ص: ۱۲۸۔ (۳۹) بورگی، ڈاکٹر، دافغانستان دوم اساسی قانون تہ یوہ کتنہ، کابل: مکتبہ ندارد، س ن، ص ۳۶۔(۴۰) طالقانی، حفیظ اللہ سیرت، حاجی، حضرت مجدد الف ثانی کارنامہ ہای جہادی، مقام اشاعت ندارد: مکتبہ ندارد، ۱۳۶۶ ش ھ، ص ۱۶۹۔(۴۱) عبدالحئی حبیبی، علامہ، دافغانستان تاریخ پیھلک، کابل: مکتبہ ندارد، س ن، ص ۲۵۸۔(۴۲) ایضاً، ص: ۲۱۸۔(۴۳) ملک عبداللہ، افغانستان قدیم وجدید، لاہور: الفیصل ناشران کتب، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۰۲-۱۰۳(۴۴) ابراہیم عطائی، دافغانستان پر معاصر یوہ لنڈ کتنہ، ص: ۲۲۶۔(۴۵) ایضاً، ص: ۲۲۳۔(۴۶) پائندہ، محمد ظہیر، یوسف علمی، دافغانستان دمعارف تاریخ، کابل: مطبوعہ معارف، ۱۹۶۰ء، ص: ۳۷-۴۱(۴۷) رشتیا، سید قاسم، افغانستان درپنج قرن اخیر، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۳۲۹ ش ھ، ۱/ ۶۶۵-۶۷۰(۴۸) ایضاً، ص: ۶۷۸۔(۴۹) غبار، غلام محمد میر، افغانستان درمسیر تاریخ، کابل: مکتبہ ندارد، ۱۳۲۸ ش ھ، ص: ۷۰۔(۵۰) حسن بیگ، افغانستان کے مشائخ مجددیہ کی علمی وفکری خدمات (مطالعہ وجائزہ)، غیر مطبوعہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۱۔(۵۱) اقبال، علامہ، کلیات اقبال فارسی، جاوید نامہ، نمودار میشود روح ناصر خسرو علوی وغزلی مستانہ سرائیدہ غائب میشود، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص: ۶۴۷۔

قاضی محب اللہ بہاریؒ کا ایک رسالہ اصول فقہ
(تعارف و تلخیص)

مولوی طلحہ نعمت

ناظرین معارف اگست ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں حضرت قاضی محب اللہ بہاریؒ کے مفصل حالات ملاحظہ فرما چکے ہیں، اس مضمون میں قاضی صاحب کے ایک رسالہ کا (جو اصول فقہ کی ایک اہم بحث پر مشتمل ہے) ذکر آیا تھا۔ نیز ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں اس کے ایک قلمی نسخہ کی موجودگی اور صاحب نزہۃ الخواطر کی تلخیص کا بھی تذکرہ کیا گیا تھا۔

پیش نظر مضمون میں نسخۂ ندوۃ العلماء کا (جو راقم کے علم میں اس کتاب کا واحد نسخہ ہے) تعارف و تلخیص ناظرین کے پیش خدمت ہے۔ مختلف فہرستوں کی مراجعت، کتب خانوں میں تلاش و تحقیق کے باوجود اس کے کسی دوسرے نسخہ کا علم نہ ہوسکا، ناظرین معارف سے گذارش ہے کہ اگر انہیں اس کتاب کے کسی دوسرے نسخہ کا علم ہو تو معارف ہی کے ذریعہ اس سے مطلع فرمائیں تاکہ اس کی اشاعت میں سہولت ہو۔

کتاب متوسط سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، آغاز کتاب میں ایک مقدمہ ہے جس میں حمد و ثنا کے بعد مصنف نے کتاب کی وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عام طور پر یہ مشہور کردیا گیا ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد قیاس پر رکھی گئی ہے جس کی بنا پر اس مسلک سے بدگمانی بڑھتی جارہی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو فقہ شافعی میں قیاس کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔

وجہ تالیف کا ذکر کرنے کے بعد مصنف نے بادشاہ وقت شاہ عالم کی طرف اس کتاب کا انتساب کیا ہے اور اس کو طویل القاب و آداب اور دعاؤں سے نوازا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ

استھانواں نالندہ۔

کتاب قاضی صاحب کے آخری دور کی تصنیف ہے، کیونکہ جس سال شاہ عالم نے اپنے پدر بزرگوار اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد زمام حکومت سنبھالی اور قاضی صاحب کو متحدہ ہندوستان بشمول افغانستان کی صدارت (شیخ الاسلام) کے خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا، اسی سال (۱۱۱۹ھ) قاضی صاحب نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

قاضی صاحب کے قدیم سوانح نگاروں نے اس رسالہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے، سب سے پہلے صاحب نزہۃ الخواطر نے اس کا تعارف کرایا اور قاضی صاحب کے تذکرہ کے ذیل میں اس کا خلاصہ بھی پیش کیا۔ اس کا نسخہ سوانح نگار کے پیش نظر تھا جو اس وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی زینت ہے لیکن اس کے باوجود اس نسخہ کی توثیق اور استناد قابل اطمینان ہے، جس کی وجہ شاہ عالم کے نام انتساب کے علاوہ یہ بھی ہے کہ پیش نظر نسخہ مصنف کے دور ہی کا تحریر شدہ ہے۔ یہ نسخہ نسخۂ مصنف سے منقول ہے جیسا کہ خاتمہ کی حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

"تمت الرسالة المنقولة المسماة بترجيح الحنفية على الشافعية المنقولة من الرسالة المكتوبة بخطّ مولانا الفاضل العالم المؤلف لهذه الرسالة المذكورة يوم الجمعة شهر شوال سنة ثلاثة (ثلاث) و ثلاثين بعد الألف و المأتين من الهجرة المقدسة بخط الموفق بالتوفيق الجميل المسمى بحمد خليل من مسجد التكية بتكليف أضعف .... عبد الله و أعصاهم و أفسقهم محمد إسحاق اللهم اغفر له و لكاتبه و لمن يتمتع بها و لجميع المؤمنين آمين يا رب العالمين"۔

کتاب کا آغاز حسب ذیل الفاظ سے ہوتا ہے:

"الحمد لله الذى برأ الاجتهاد و جعل العمل به مناطا لسعادة يوم التناد و ذلک من رحمته على العباد انه لا يخلف الميعاد و الصلاة و السلام على النبي العربي الذي انبأنا عن المبدأ و المعاد و الذي هدانا الى السداد و لكل قوم هادوا على آله الذين و دادهم رضا و الرشاد و على أصحابه الذين شاركوه فى الجهاد و نشروا دينه فى البلاد و على علماء الذين هم ......

الشداد و علی جمیع المؤمنین و المؤمنات أبد الآباد‘‘۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر کتاب کا نام ’’ترجیح أن الحنفیة أبعد عن الرأی من الشافعیة‘‘ مذکور ہے، جو درحقیقت موضوع کا تعارف ہے کتاب کا اصل نام نہیں۔

مصنف کتاب نے ترجیح کے چھ اسباب و وجوہ بیان کیے ہیں اور تفصیلی مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے مثالوں کو حذف کر کے صرف ان وجوہ و اسباب کی تلخیص پیش کی ہے، جس کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

پہلی دلیل: حنفیہ کا کہنا ہے کہ کتاب و سنت کا عام حکم قطعی ہے، لہٰذا اس میں قیاس جائز نہیں، جبکہ شوافع اس کے برعکس اس میں قیاس کی اجازت دیتے ہیں، احناف قیاس کے ذریعہ حکم عام کی تخصیص نہیں کرتے بلکہ ایسے موقع پر رائے کو باطل قرار دیتے ہیں۔

دوسری دلیل: شوافع نے قیاس کی بنیاد پر مطلق کو مقید کیا جبکہ حنفیہ ایسا نہیں کرتے۔

تیسری دلیل: مرسل حدیثیں احناف کے یہاں قابل قبول ہیں اور انہیں قیاس پر مقدم رکھا جاتا ہے جبکہ امام شافعی مرسل حدیث پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

چوتھی دلیل: اگر قول صحابی کوئی ایسی بات ہو جس کا قیاس کی بنیاد پر کہنا مشکل ہو تو وہ حنفیہ کے نزدیک حجت ہے اور اسے رائے پر مقدم کیا جائے گا۔

پانچویں دلیل: کتاب اللہ سے جس عبارت کا اطلاق ثابت ہو چکا، اس میں اپنی رائے یا کسی جزئیہ یا شرط کا اضافہ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہ کے یہاں یہ نسخ قرآن ہے۔

چھٹی دلیل: صحت رائے کے اثبات میں بھی حنفیہ نے احتیاط سے کام لیا ہے، ان کے نزدیک علت جس کے ذریعہ فرع کو اصل پر قیاس کیا جائے گا، وہ بھی اسی وقت موثر ہوگی جب کہ کسی نص یا اجماع سے ثابت ہو، حالانکہ شافعیہ کے نزدیک صرف مناسبت کافی ہے۔

ساتویں دلیل: شوافع کے نزدیک حدود و کفارات قیاس سے بھی ثابت ہو جاتے ہیں جبکہ حنفیہ ان میں قیاس کو موثر نہیں مانتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو تعزیرات ہیں، وہ قیاسی ہیں۔

اخبار علمیہ

”سو زبانوں میں ترجمۂ قرآن کی اشاعت کا منصوبہ“

گذشتہ پانچ برسوں سے ترکی حکومت عالمی مسابقہ حفظ قرآن کا اہتمام کررہی ہے۔اس میں ۶۲ ممالک کے حفاظ شامل ہوتے ہیں۔پچھلے دنوں اسی مناسبت سے انقرہ میں تقسیم انعامات کی تقریبات منعقد کی گئیں۔جس میں ترکی میں دینی امور کے انچارج محمد غورمان اور صدر مملکت رجب طیب اردگان بھی شریک ہوئے۔صدر نے اپنے خطاب میں کہا کہ قرآن مجید کے ساتھ تعلق ہماری زندگی کا مقصد اولین ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے دلوں کا تزکیہ اسی کتاب سے ہوسکتا ہے۔محمد غورمان نے کہا کہ شعبۂ دینی امور کی جانب سے دنیا کی ۲۵ زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم شائع کیے جاچکے ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ آیندہ دو سالوں میں دنیا کی سو مختلف زبانوں میں ترجمۂ قرآن شائع کیا جائے اور اس کو دنیا کے ہر ملک اور ہر شہر وبستی میں پہنچانے کا عزم کیا جائے۔اس کے لیے ”میرا تحفہ قرآن مجید ہوگا“ کے سلوگن کے تحت رقم کی فراہمی کی مہم شروع کی جاچکی ہے جس میں تمام ہم وطن مسلمان دل کھول کر حصہ لے رہے ہیں۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، جون ۲۰۱۷ء)

”اذان سے متعلق نئے قوانین“

شمالی افریقہ میں واقع الجزائر میں کل ۱۵ ہزار مسجدیں ہیں۔پانچ ہزار مسجدیں زیر تکمیل ہیں۔ائمہ ومؤذنین کی تنخواہیں بشمول دوسرے تمام اخراجات حکومت کی جانب سے ادا کی جاتی ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں اس ملک کے لبرل طبقہ کی جانب سے اذان کی آواز بالخصوص عشاء اور فجر کے وقت رہائشی علاقوں میں آہستہ رکھنے کی مہم چلائی گئی تھی لیکن یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی تھی۔مگر اب خبر ہے کہ حکومت کی جانب سے مؤذنین کے لیے نئے قوانین متعارف کرائے جائیں گے۔اس کا اعلان مؤذنین کے لیے قائم کیے گئے ایک تربیتی کیمپ میں کیا گیا۔رپورٹ کے مطابق ان قوانین میں اخلاص نیت، اذان کے لیے وقت اور الفاظ کی ادائیگی میں مخارج اور تجوید کے تمام قواعد کی پابندی شامل ہوگی۔

(صراط مستقیم، برمنگھم، مئی ۲۰۱۷ء)

''یونائیٹڈ تھیولوجیکل کالج لائبریری میں مخطوطات''

یونائیٹڈ تھیولوجیکل کالج، بنگالورو کی بنیاد ۱۹۱۰ء میں رکھی گئی۔ مگر اس کتب خانہ کو معیاری لائبریری کی صورت میں ۱۹۶۸ء میں اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب لوگوں نے فراخ دلی کے ساتھ اپنی کتابیں اس کو دینا شروع کی۔ اس توجہ کے نتیجہ میں کتابوں کا ذخیرہ تیزی کے ساتھ بڑھا اور اس وقت اس میں کل ۹۵ ہزار کتابیں، جریدوں کے ۲۷۲ سرِورق، تاریخی ریکارڈ کی ۲۰۴ مائیکروفلم اور ۲۳ ہزار ۲۳ مائیکروفیچرز موجود ہیں۔ اس کتب خانہ کی قابل فخر مذہبی اور سیولر یادگاروں میں مارٹن لوتھر کمنٹری آن گلاٹینس (۱۵۲۳ء) برتھولوماؤس زی جین بالگس گرامیٹکا ڈیمولیسا (۱۷۱۶ء) زی جین بالگس، جوھانن ارنسٹ گرنڈلرس اینڈ بینجامین شلزیز ببلیا ڈیمولیسا (۱۷۱۴-۱۷۲۸) مہاتما گاندھی کے خطوط، تمل زبان میں ہندوستان میں چھپی پہلی نیوٹیسٹامنٹ، ۱۸ویں صدی کے تمل شاعر اور گلوکار ویدانیاگم سستر یار اور ادب، تاریخ، علم الانسان، سماجیات اور سائنس کے بہت سے متون موجود ہیں۔ کالج کے تہ خانے میں تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے ۵ ہزار سے زیادہ مخطوطات قابل توجہ ہیں۔ جن میں ۱۸ویں اور انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی ثقافتی ورثہ کی تاریخ درج ہے۔ یہ تحریریں لوک ادب، دیسی دواؤں کے نسخے، مذہب، علم نجوم، علم فلکیات، ثقافتی طور طریقے، جانوروں کے علاج کی دوائیں، علم زراعت، دست کاری اور ہنرمندی تمام طرح کے علوم کا احاطہ کرتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ذمہ داروں نے انہیں ڈیجیٹل صورت میں مہیا کرانے کا عزم کیا ہے اور اس منصوبہ پر تیزی سے کام بھی جاری ہے۔ ان مخطوطات کے علاوہ کالج میں موجود نادر کتابوں کو بھی ڈیجیٹائز کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ان میں ۶۰ سے زیادہ ایسی نادر کتابوں کی نشان دہی کی جاچکی ہے جو دنیا میں کہیں بھی آن لائن دستیاب نہیں ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یہ تاریخی دستاویزات بہت توجہ سے لپیٹ کر ایرکنڈیشنڈ تہ خانہ میں رکھی گئی ہیں۔ رکھنے سے پہلے کیڑے مار دوا، مومی کاغذ اور چوبی صندوق کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاڑ کے پتوں کو وقفہ وقفہ سے نیم اور سنبل ہندی تیل چھڑک کر محفوظ کیا جاتا ہے اور روایتی ڈھنگ سے لال کپڑے میں باندھ دیا جاتا ہے۔

(اسپین، نئی دہلی، مئی جون ۲۰۱۷ء)

”ڈیزائن دار پھلوں اور سبزیوں کی مقبولیت“

جاپانی زرعی ماہرین نے پہلی مرتبہ ڈیزائن دار پھلوں کو اگانے کا تجربہ کیا تھا۔ انہوں نے اگنے والے پھلوں کے لیے ڈیزائن دار ڈائی تیار کی جس میں سوراخ تھے تاکہ پھل آکسیجن کی کمی کے سبب افزائش سے محروم نہ رہیں۔ جب پھل بڑے یا پکنے کے لیے تیار ہوئے تو ڈائی کے اسکرو کھول دیے گئے اور اس طرح یہ پھل خاص شکل میں تیار ہوئے، جو عوام اور خریداروں کے لیے نئی چیز تھی۔ تاہم اب چینی کمپنیوں نے اپنی ذہنی اختراع اور ٹیکنالوجی کی مدد سے اس جانب خصوصی توجہ کی ہے۔ اور اس کے تیار کردہ ڈیزائن دار پھل اور سبزیاں دنیا بھر میں تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں۔ ستارے کی شکل کا کھیرا، چوکور سیب، دل کی ساخت والے تربوز، گوتم بدھ سے مشابہ ناشپاتی کی مانگ سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ لوکی، کدو، ٹماٹر، گاجر اور دیگر اقسام کے ڈیزائن دار پھل اور سبزیاں تیار کر کے دنیا کے مختلف ممالک میں بھیجی جا رہی ہیں۔ آئن اسٹائن اور ٹرمپ کی شکل کے کدو بھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ رپورٹ میں ایک چینی ماہر کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ چینی کمپنیاں اس وقت دل کی شکل کے سیب اور گوتم بدھ کی ساخت والی ناشپاتیوں کی عالمی مانگ کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ سیب کو چوکور اور دل کی شکل میں اس طرح تیار کیا جا رہا ہے کہ ننھے سیبوں پر چڑھائی جانے والی پلاسٹک کی ڈائیوں کے اندرونی حصہ میں Love انگریزی لفظ کو امپوز کر دیا گیا اور جب یہ سیب ڈائیوں میں نشوونما پا کر بڑھے تو ان کی ساخت گول کے بجائے دل کی طرح ہو گئی اور ان کی بیرونی سطح پر Love لکھا ہوا تھا۔ معروف چینی کمپنی، فروٹ مولڈ چائنا کا کہنا ہے کہ ہم نے سبزیوں اور پھلوں کی ساخت میں اس تبدیلی سے دنیا بھر میں ایک واضح پیغام بھیجا ہے کہ سبزیوں اور پھلوں کی پرانی ساخت کو فراموش کر دیجیے اور ہمارے فارم ہاؤس کے نت نئے ساخت کے پھلوں اور سبزیوں کا دہرا لطف اٹھائیے۔ یہ بظاہر حیرت انگیز اور پرکشش تو ہیں ہی، ساتھ ہی کھانے میں قدرتی ذائقہ کی حامل بھی ہیں۔

(منصف، حیدرآباد، ۱۸؍جون ۲۰۱۷ء)

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

حکیم نجم الغنی خان رام پوری کی ''نہج الادب'' کی ایرانی اشاعت

ڈاکٹر عارف نوشاہی

۲۰۱۵ء کے مارچ کا آخری عشرہ تھا۔ایران میں جشن نوروز کے ایام چل رہے تھے۔ایرانی ان دنوں میں عام طور پر گھروں سے نکل جاتے ہیں، سیر وسیاحت کرتے ہیں۔تفریحات مناتے ہیں اورغم روزگار کو بھولے رہتے ہیں۔لیکن تعطیلات وتفریحات کے عین وسط میں ۲۵/مارچ کو مجھے ایک ایرانی خاتون۔ڈاکٹر زہرہ مشاوری، جنہیں میں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔کا اصفہان نصف جہان سے ای میل موصول ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ ایک ہندوستانی مصنف نجم الغنی خان رام پوری کی تصنیف ''نہج الادب'' کی تحقیق وتدوین میں مصروف ہیں، لیکن وہ مصنف کے حالات زندگی سے قریب قریب بے خبر ہیں، لہٰذا اس بارے میں ان کی راہ نمائی کی جائے۔اس احقر کو آئے دن ایران سے مختلف ذرائع ابلاغ سے اس نوعیت کے پیغامات آتے رہتے ہیں۔کسی کو فلاں کتاب کے مزید مخطوطات کے کوائف درکار ہیں، کوئی پاکستان وہند سے قلمی نسخوں کا عکس چاہتا ہے، کسی کو برصغیر کے مصنّفین اور رجال پر مآخذ چاہییں۔وقس علی ھذا۔میں اس کام کو ایک علمی فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہوں اور مقدور بھر کمک کر کے شادمان ہوتا ہوں۔خود مجھے بھی باہر کی دنیا سے علمی معاملات میں ایسی ہی علمی کمک کی ضرورت رہتی ہے اور جب وہ ضرورت پوری ہوتی ہے تو ایک گونہ مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔

حکیم نجم الغنی خان کے بارے میں پاکستان میں جو مواد شایع ہوا ہے وہ میری دسترس میں تھا

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

اور کچھ ہندوستان سے محبی ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کی عطا سے دستیاب ہوا، وہ سب جمع کر کے ڈاکٹر زہرہ مشاوری کی نذر کیا۔ اب ان کے کچھ اور سوالات بھی آنے لگے کہ نہج الادب میں کچھ اردو الفاظ/ جملے آئے ہیں، ان کا کیا مطلب ہے؟ وہ مطلب بھی انہیں سمجھایا۔ پھر یہ سوال ہوا کہ نجم الغنی نے اپنی کتاب میں فارسی کا فلاں لفظ استعمال کیا ہے لیکن ایران میں تو اس کا کوئی اور مطلب ہے! ہندوستانی فارسی میں آپ لوگ اس کا کیا مفہوم لیتے ہیں؟ چنانچہ ایسے ''مہندات'' کی فرہنگ بھی ان کو لکھوائی۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ میں خود اتفاق سے جولائی ۲۰۱۶ء میں اصفہان جا پہنچا اور ڈاکٹر مشاوری کے نہج الادب پر پورے کام کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو قریب قریب اشاعت کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اب مئی ۲۰۱۷ء میں ایران میں عالمی کتاب میلے کے موقع پر نہج الادب کو شایع شدہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مشاوری کی اس تحقیق و تصحیح کو انتشارات سخن، تہران نے دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ کتاب کے کل ۱۱۲۲ صفحات ہیں۔ (پہلی جلد ص ۱۔۴۰۸؛ دوسری جلد ص ۴۰۹۔۱۱۲۲)۔

حکیم نجم الغنی خان رام پوری (۱۸۵۹۔۱۹۳۲ء) کا پیشہ تو طبابت تھا لیکن اس دور کی تہذیب میں ہمارے اطبا، مصنف، شاعر اور مورخ بھی ہوا کرتے تھے۔ سو یہ سب خوبیاں حکیم نجم الغنی خان میں بھی جمع تھیں۔ ایسے مجمع الصفات شخص کی نوابان ریاست رام پور بھلا قدر کیوں نہ کرتے۔ نوابوں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور نواب رضا علی خان انہیں ریاست کے سرکاری کتب خانے (رضا رام پور اسٹیٹ لائبریری) میں لے آئے جہاں حکیم صاحب نے خوب علمی کام کیے۔ حکیم صاحب نے عربی، فارسی اور اردو میں دینی، تاریخی، ادبی، بلاغی اور طبی موضوعات پر کم و بیش ۳۶ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ کچھ کو اپنے صرفے سے چھپوایا اور کچھ دیگر مطبعوں اور اداروں سے شایع ہوئیں اور چند ایک ہنوز قلمی حالت میں پڑی ہیں۔

حکیم صاحب کو علوم بلاغت اور قواعد زبان پر خاص دسترس تھی۔ ان علوم پر ان کی دو تصانیف کو خاص شہرت اور مقام حاصل ہوا ہے۔ بلاغت پر بحر الفصاحت، اردو میں لکھی اور پہلی بار مطبع سرور قیصری، رام پور سے چھپی۔ فارسی قواعد پر نہج الادب فارسی میں تحریر کی جو اولین بار مطبع نول کشور لکھنو سے ۱۹۱۹ء میں طبع ہوئی اور اب ۹۸ سال بعد ۲۰۱۷ء میں یہ ایران میں دوبارہ چھپ کر زندہ ہو گئی ہے۔

نہج الادب، جیسا کہ بیان ہوا، فارسی زبان کے قواعد پر مشتمل ہے اور اسے عربی زبان کے لیے رائج دستور کی طرح دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ علم صرف سے متعلق ہے اور دوسرا علم نحو سے، چنانچہ ایرانی اشاعت میں جلدوں کی تقسیم بھی اسی اعتبار سے ہوئی ہے۔ حصہ صرف میں فعل، اسم، حرف، حرکات وسکنات حروف، آداب املا اور فارسی رسم الخط پر مباحث ہیں۔ حصہ نحو میں کلمہ، کلام اور ملحقات مفعول، توابع، مقدرات اور محذوفات کی بحثیں ہیں۔ ایک ''خاتمۃ الکتاب'' بھی ہے، جس میں فارسی زبان کی اقسام، فارسی زبان کی کیفیت، ایرانی اور تورانی محاورے، حقیقت لغت اور لغت کی معتبر کتابیں، قیاس سے لغت کا ثبوت، قرینے سے کلمات وضع کرنا، عربی زبان میں تفریس اور ہندی زبان میں تفریس وتہنید کے مباحث ہیں۔ ان سب چیزوں کا اس قدر جزئیات اور شواہد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ نہج الادب فارسی قواعد زبان پر ایک دایرۃ المعارف کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ فارسی قواعد زبان اور لسانیات کے حوالے جو خدمات اہل ہندو پاکستان کی ہیں وہ خود اہل زبان کی نہیں ہیں۔ یہ فضل تقدم ہمیں حاصل ہے کہ فارسی گرامر پر پہلی مستقل کتاب عبدالصمد ملتانی نے ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰ء میں لکھی اور اس کا نام اصول فارسی رکھا۔ ایران میں کوئی ۱۵۰ سال بعد اس طرف میرزا حبیب اصفہانی (۱۸۳۵۔۱۸۹۳ء) نے توجہ دی اور فارسی کا دستور لکھا۔

نہج الادب ۱۹۱۹ء میں منشی نول کشور کے مطبع واقع لکھنؤ میں اس طریقۂ طباعت سے چھپی تھی جسے لیتھو یا پتھر کا چھاپہ کہتے ہیں۔ سنگی کتابوں کی طباعت، صحت اور قراءت کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر نے پروفیسر ایڈورڈ براون کی تاریخ ادبیات ایران کے اردو ترجمے کے دیباچے میں پروفیسر براؤن سے یہ بات منسوب کی ہے کہ انہیں ہندوستان کی چھپی ہوئی کتابوں سے گھن آتی تھی اور نول کشوری مطبع کی کتابیں جس بے احتیاطی سے تیار ہوتی تھیں اس کو وہ علم دشمنی سمجھتے تھے۔ پروفیسر براؤن کی اس رائے سے مجھے مکمل اتفاق تو نہیں ہے اور نہ ہی مطبع منشی نول کشور اور اس جیسے پچاسیوں مطبعوں میں چھپی ہوئی کتابوں کو علم دشمنی کہا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرقی اور انسانی علوم کا تذکاران پرانی کتابوں کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور اگر برصغیر میں سنگی یا اس سے ملتے جلتے قدیم وضع کے مطبع نہ ہوتے تو آج ہم اس علمی میراث سے بھی محروم ہوتے جس کے ہم متولی بنے بیٹھے ہیں۔ تاہم لیتھو یا پتھر پر چھپنے والے کتابوں کے بارے میں یہ رائے بالکل درست ہے کہ ان میں صحت متن

کا بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ کتاب کی صحت کا تمام تر دارومدار کاتب اور مطبع کے سنگ ساز پر ہوتا تھا۔ ان کتابوں میں رموز اوقاف کا اہتمام نہ ہونا تو بعد کی بات ہے، پیرا بندی تک نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک متن مسلسل ہے بحر طویل کی طرح۔ پڑھتے جایئے اور جہاں سانس تھک جائے وہاں رُک جایئے۔

۱۹۱۹ء میں منشی نول کشور کے مطبع میں چھپا نہج الادب کا متن، ان تمام خرابیوں کا مرقع ہے جو ایک سنگی چھاپے میں ہوسکتی ہیں۔ صرف اسی ایک ایڈیشن کی بنیاد پر اس کتاب کی تدوین نو، جب کہ نسخۂ مصنف بھی دستیاب نہ ہو، جس جان جوکھم کا کام ہے اس سے وہی لوگ واقف ہیں جنہیں کسی ایسے ایڈیشن سے واسطہ پڑا ہو اور کوئی نسخہ بدل بھی نہ ہو۔ ڈاکٹر مشاوری نے اپنی تحقیق و تصحیح میں نہج الادب کے اسی نول کشوری ایڈیشن سے نمٹا ہے اور اسے اس خوبی سے پیش کیا ہے گویا اس کا ٹاٹ کا چولا اتار کر اسے حریری خلعت پہنادی ہے۔

ڈاکٹر مشاوری نے نہج الادب کی تحقیق اور تجدید میں جو زحمت اٹھائی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ پورے متن کی خط نسخ میں ورڈ پروگرام کے ساتھ حروف نگاری؛ یہ کام انہوں نے خود انجام دیا ہے تاکہ کتابت کی کسی غلطی کا شائبہ باقی نہ رہے۔

۲۔ ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں حکیم نجم الغنی خان کے مفصل حالات اور ان کی تصانیف کا تعارف بیان ہوا ہے۔ اس ضمن میں حکیم صاحب کی ۳۶ دستیاب تصانیف کا ایک جدول بھی دیا ہے کہ ان کا ذکر کس کس مآخذ میں ہوا ہے۔ اس مقدمے کا اہم حصہ خود نہج الادب پر تبصرہ اور اس کے مندرجات کا تجزیہ ہے۔

۳۔ متن میں، سنگی چھاپے میں موجود کتابت کی اغلاط اور تصحیفات کو قیاس کی بنیاد پر درست کیا گیا ہے۔

۴۔ نہج الادب میں شواہد کے لیے مصنف نے تقریباً چار ہزار مصرعوں یا بیتوں سے کام لیا ہے جو بجائے خود ایک مکمل دیوان ہے۔ ڈاکٹر مشاوری نے ان تمام اشعار کو دستیاب مآخذ سے پرکھا ہے اور اگر ان میں کوئی سہو کتابت یا تصحیف تھی، اسے دور کیا ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسے اشعار جن کا قائل معلوم نہ تھا کوشش کر کے اس کا قائل بھی معلوم کیا ہے۔

۵۔ نہج الادب میں سینکڑوں اسماء الرجال آئے ہیں۔ خواہ مصنف کی طرف سے، خواہ مطبع کے

کاتب کی طرف سے، بعض اسماء بدیہی طور پر غلط درج ہوئے ہیں۔ڈاکٹر مشاوری نے ان کی صحت کا اہتمام کیا ہے اور مقدمے میں اس کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ نہج الادب کے نول کشوری ایڈیشن کا نذر محمد دہلوی درحقیقت ''بدر محمد دہلوی'' ہے اور جس کو وفائی ملتانی لکھا ہے وہ اصل میں ''دقاقی بلیانی'' ہے۔

ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!

۶۔نہج الادب میں جہاں جہاں اردو الفاظ آئے ہیں یا مقامی جگہوں کا نام درج ہوا ہے، ایک ایرانی مرتب کتاب کے لیے ان سے نامانوس ہونا فطری بات ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مشاوری نے ایسے تمام امور میں راقم السطور سے مشورہ کرکے ان کے صحیح اندراج کا اہتمام کیا ہے۔ یہ بات میرے مشاہدے میں آئی ہے کہ برصغیر کی کتب کے ایرانی ایڈیشن ہندی اعلام کے سلسلے میں غیر محتاط اور غیر مستند واقع ہوئے ہیں،لیکن خوش قسمتی سے نہج الادب کا یہ ایڈیشن ان اغلاط سے پاک ہے۔

۷۔نہج الادب میں جہاں جہاں عربی عبارات میں درستی کی ضرورت تھی انہیں بھی درست کردیا گیا ہے۔

۸۔ڈاکٹر مشاوری نے کتاب کے آخر میں چھے اشاریوں کا اضافہ کیا ہے: اشخاص کے اسما؛ کتب کے اسما؛ چار ہزار شعروں کے پہلے مصرع پر مبنی اشاریہ؛ اردو لغات اور ترکیبات کی فارسی فرہنگ؛ اردو عبارات کا فارسی ترجمہ؛ مشکل الفاظ اور ترکیبات کی فارسی فرہنگ۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر زہرہ مشاوری نے اپنے اس کام کے ذریعے نہ صرف حکیم نجم الغنی خان کی روح کو آسودہ کیا ہے بلکہ حکیم صاحب کی کام کی قدرشناسی اور اس کی شایان شان طریقے سے تجدید کرکے ہم اہل برصغیر پر علمی احسان بھی کیا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

معارف کی ڈاک

نقوش سلیمانی اور مقدمہ شعلہ طور
(''تعارف نو وارد شاعر'')

اسلام منزل، اسٹریٹ نمبر-۸
اقرا کالونی، علی گڑھ
۱۹/۶/۲۰۱۷ء

مدیر محترم ''معارف''

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے نوٹ کے ساتھ ''تعارف نو وارد شاعر'' کی ٹائپ شدہ کاپی معارف کو ارسال کرنے پر مجھے یہ اطلاع ملی کہ یہ تعارف ''نقوش سلیمانی'' میں شامل ہے۔ میں نے پروفیسر ندوی صاحب کو اس سے باخبر کیا تو انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ان کے پاس ''نقوشِ سلیمانی'' کا جو نسخہ ہے اس میں یہ موجود نہیں ہے۔ اس پر جستجو ہوئی کہ علی گڑھ میں دستیاب اس کے نسخوں کو دیکھا جائے۔ اپنے شعبہ (اسلامک اسٹڈیز) کی لائبریری میں تلاش کیا تو اس کے دو نسخے ملے: ایک ۱۹۶۷ء کا جو اردو اکیڈمی سندھ، کراچی کا شائع کردہ ہے اور دوسرا ۱۹۸۰ء کا جو دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کا مطبوعہ ہے۔ دونوں کے موازنہ سے یہ انکشاف ہوا کہ ۱۹۶۷ء والے نسخہ میں مقدمہ شعلۂ طور (''تعارف نو وارد شاعر'') موجود نہیں ہے۔ پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے پاس غالباً یہی نسخہ ہوگا۔ مقام مسرت ہے کہ ۱۹۳۹ء میں دارالمصنّفین سے شائع شدہ ''نقوش سلیمانی'' کا پہلا ایڈیشن مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے اردو سیکشن میں محفوظ ہے۔ برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین) کی عنایت سے اسے بھی دیکھنے کا موقع ملا اور اس کے مشتملات میں باب ''مقدمات'' کے تحت مقدمہ شعلہ طور (''تعارف نو وارد شاعر'') کو موجود پایا۔ محولہ بالا پاکستانی ایڈیشن (۱۹۶۷ء) میں اس تعارف کی عدم شمولیت کی وجہ اس کے دیباچہ سے صاف واضح ہوجاتی ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ ۱۹۵۰ء میں کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دیگر کتابوں کے ساتھ ''نقوش سلیمانی'' کی بھی یہاں دوبارہ طباعت کا اہتمام فرمایا۔ اس کے نئے ایڈیشن کی تیاری کے دوران کتاب کے مشتملات کا تیسرا باب

''مقدمات'' (جس کے تحت مختلف کتابوں پر سید صاحب کے تحریر کردہ مقدمے و دیباچے جمع کیے گئے تھے) اس وجہ سے حذف کر دیا گیا کہ ان تمام مقدمات کو الگ ایک کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس ایڈیشن کے تعارف میں مصنف گرامی رقم طراز ہیں:

> ''نقوش کا موجود نسخہ گذشتہ نسخہ کا نقش ثانی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا نسخہ تین بابوں پر منقسم تھا: خطبات، مقالات اور مقدمات۔ یہ نسخہ صرف دو بابوں پر مشتمل ہے: خطبات اور مقالات۔ مقدمات کا باب اس لیے الگ کر لیا گیا ہے کہ مقدمات کی ایک الگ جلد زیر ترتیب ہے''۔

اس ضمن میں یہ بات تحقیق طلب ہے کہ مقدمات کی یہ ''زیر ترتیب جلد'' بعد میں الگ سے کتابی صورت میں شائع ہوئی کہ نہیں۔ اس کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکی ہے۔ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے ''نقوش سلیمانی'' کا جو ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے اس میں ''مقدمات'' کا باب بدستور شامل ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقدمات کے مجموعہ کی جداگانہ اشاعت عمل میں نہیں آئی۔

بہر حال محب گرامی و مشفقی پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے ''شعلہ طور'' کے اولین ایڈیشن سے متعلق استفسار نے اس ناچیز کو ابن سینا اکیڈمی میں اس نایاب نسخہ تک رسائی کا موقع فراہم کیا اور اسی ضمن میں دیگر سوالات نے ''نقوش سلیمانی'' کی نسبت سے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ ان سب سے اس قول کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ سوالات سے علم کے دروازے کھلتے ہیں۔ (السوال مفتاح العلم)

والسلام

(پروفیسر) ظفر الاسلام اصلاحی

تصحیح تاریخ وفات حضرت محمد سعید مجددیؒ

گیان پور، یوپی

محترمی! سلام مسنون

جون کے معارف میں حضرت پیر محمد سعید میاں مجددیؒ کے ذکر میں ان کی تاریخ وفات ۳۰/ مارچ لکھی گئی، یہ سہو ہے۔ ان کا انتقال ۳۰/ اپریل ۲۰۱۷ء کو ہوا تھا، تصحیح ہو جائے تو بہتر ہے۔ والسلام

(جناب) شاہ ظفر الیقین

ادبیات

غزل

ڈاکٹر حیات عامر حسینی

روئے ناز گل فشاں ایں جانمود
بوئے یار زر فشاں ایں جانمود

تار جان گل بدن مضراب شد
تار ساز داستاں ایں جانمود

اے سفیر دودمانِ ضو فشاں
یک صدائے دُرفشاں ایں جانمود

من ندانم داستانِ دل بری
آں سراپا داستاں ایں جانمود

رزم گاہ زندگی افسانہ شد
التجائے رفتگاں ایں جانمود

گاہے گاہے دیدہ ام پرکار دوست
گاہے گاہے رازداں ایں جانمود

یک نگاہ دلبرے رقص زماں
در پناہ عاشقاں ایں جانمود

دشت مجنوں آبروئے مے کشاں
دیدہ ام آ ہوِ جاں ایں جانمود

اے رز رخشندگی رخصت مشو
رخت ساز تشنگاں ایں جانمود

نوحہ خوانی از زمین ما شناخت
کے فسونِ آسماں ایں جانمود

شعبہ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

غزل

ڈاکٹر رؤف خیرؔ

سرنامہ بنا کر جسے ''واوین'' میں رکھا
حیرت ہے اسی نے ہمیں قوسین میں رکھا

کچھ دن ہی میں رکھا ہے نہ کچھ رین میں رکھا
سچ تو ہے مرا چین ترے نین میں رکھا

کچھ لطف نہ شرقین نہ غربین میں رکھا
اب تیرے سوا خاک ہے کونین میں رکھا

خیموں کو تنافر نے غم و بین میں رکھا
تفضیلِ معاویہ و حسنین میں رکھا

ہر ذرۂ پرنور کو پلکوں ہی سے چوما
سر جب بھی حرم زارِ شریفین میں رکھا

اک ہاتھ میں قرآن ہے اک ہاتھ میں سنت
اس نے تو ہمیں حلقۂ نورین میں رکھا

خاکی ہوں مگر خاک بسر ہو نہیں سکتا
دنیا کو یہی سوچ کے نعلین میں رکھا

اب پار اترنے کی توقع بھی کسے تھی
کاغذ کا سفینہ تھا جو بحرین میں رکھا

دلّی کے حوالے ہوئے صادق جو تھے مولا
کیا اپنے لیے خیرؔ ہے اُجّین میں رکھا

مکان نمبر:9-11-137/1، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد۔ (موبائل 09440945645, 9885700350)

مطبوعات جدیدہ

آخری وحی (جلد اول و دوم): از مولانا سید سلمان حسینی ندوی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات بالترتیب ۶۰۴، ۶۱۲، قیمت: ۲۵۰، ۳۰۰ روپے، پتہ: مکتبۃ الشباب العلمیہ، بروليا، ٹیگور مارگ لکھنؤ اور لکھنؤ کے دوسرے مشہور مکتبے۔

قرآن مجید کے ترجمہ وتوضیح کی اس نئی اور مبارک کوشش کا سرآغاز اس جملے سے ہے کہ ’’اردو ترجمانی کے جدید قالب میں‘‘ اس سے صاف ہوجاتا ہے کہ ترجمہ سے زیادہ ترجمانی کی گئی ہے اور انداز پیش کش بھی اب تک کے ترجموں سے کچھ الگ ہے اور اسی لیے اس کو ’’جدید قالب‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے متعدد اردو ترجمے اور تفسیریں ابھی قدیم کے درجہ میں نہیں ہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ جدید کے درجہ ہی میں ہیں لیکن پڑھنے والوں کی نظر میں خواہ وہ مدح ہو یا قدح، قرآن کی صفت عجب سب سے نمایاں اور زبان پر رہی۔ یہ عجبیت، ہر آن، قرآن کو نئی شان عطا کرتی رہی، قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر کوشش اسی شان عجبیت کا ظہور رہے۔ اس آخری وحی کے جدید قالب میں جو جدیدیت ہے وہ شاید ترجمہ اور ترجمانی کے آمیزہ سے خوش گوار روانی ہے اور اس سے زیادہ نئے انداز کے ابواب وفصول کی تقسیم ہے۔ مثلاً باب اول میں فاتحہ تا مائدہ سورتیں شامل ہیں، جو چار فصلوں میں منقسم ہیں، پہلے باب کی سرخی ہے، ’’یہودیوں اور عیسائیوں کی تحریفات وانحرافات اور امت مسلمہ کی تشکیل‘‘ پھر ہر فصل اسی طرح کی سرخی کے تحت ہے۔ یہی نہیں جگہ جگہ ذیلی سرخیوں سے مضامین کے تعارف میں آسانی بھی کی گئی ہے۔ ترجمے اور ترجمانی کا انداز مثال کے طور پر ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم الخ کی آیت میں ملاحظہ ہو کہ جو لوگ منکر (احسان ناشناس کٹے کافر، ضدی اور عنادی ہیں) ان کے لیے برابر ہے، آپ انہیں آگاہ کریں (خبردار کریں) یا نہ کریں وہ ماننے والے نہیں۔ یہی انداز اول تا آخر ہے۔ فاضل ترجمان ومترجم کے عربی زبان کے اداشناس ہونے میں کوئی

کلام ہی نہیں، کلام الٰہی سے ان کا تعلق بھی غیر معمولی ہے۔ ندوہ میں وہ استاذ تفسیر ہیں، ان کے دوسرے حلقات درس میں بھی تجلیات قرآنی ہی کا غلبہ ہے، اردو زبان گھر کی ہے، جو شستگی، سلاست، شگفتگی سے عبارت ہے، ترجمانی قرآن کے فرض اور نہایت نازک فرض کو سلیقہ سے ادا کرنے کی جو بھی شرطیں ہیں وہ ان میں پائی جاتی ہیں اور اس کا اعتراف آخری وحی کے ابتدائی کلمات میں فراخی دل سے کیا بھی گیا ہے۔ اعتراف کرنے والوں میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی اور جناب عیسی منصوری جیسے اصحاب نظر ہیں۔ اس پر مستزاد قرآن کی کہانی خود قرآن کی زبانی اور فاضل مترجم کے قلم سے ترجمہ قرآنی اور میری کہانی نے بھی آخری وحی کو سمجھنے میں مدد کی ہے۔ چونکہ مترجم کا ذہن تقلیدی سے زیادہ تجدیدی ہے، اس لیے کہیں کہیں باخبر قارئین کو "عجب" ہونے کا احساس ہوسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس ایمان میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے کہ بے شک قرآن یھدی الی الرشد فآمنا بہ۔ قرآنیات کے اردو خزانہ میں ان دونوں جلدوں کے بیش قیمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

نقوش افکار: از جناب وارث ریاضی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۷۶، قیمت: ۳۰۰/روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ مکتبہ جامعہ، مکتبہ دارالمصنفین اور بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔

جناب وارث ریاضی قارئین معارف کے لیے معروف ہیں، ان کے تعارف میں سب سے پہلے ان کی شاعرانہ خوبی کا ذکر لبوں پر آجاتا ہے، لیکن یہ مجموعہ ان کی نثری صلاحیت بلکہ کاملیت کا اظہار ہے۔ کبھی کسی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا تھا کہ "بعض چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دوسطریں سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے، مشاہدہ بہرحال کلیہ نہیں، اور کسی درجہ میں اس کلیہ پر اصرار ہو تو بھی یہ استثناء کے قاعدہ سے جدا نہیں، اور اس کی ایک مثال یہ مجموعہ مضامین ہے۔ یہ مجموعہ کم گلدستہ زیادہ ہے، جس میں اسلامیات، اقبالیات، تعلیمات اور شخصیات پر ایسی تحریریں آگئی ہیں جن سے مشام جان معطر ہوتا جاتا ہے، گلہائے رنگارنگ، خوشبوؤں کی سوغات بکھیرتے جاتے ہیں اور پڑھنے والا تحریر کے حسن، مطالب کی افادیت اور خیر کی کثرت سے خود کو کسی اور ہی جہاں میں موجود پاتا ہے۔ تعلیمات کے موضوع پر ان کا پہلا مضمون "تسلط ہے دنیا پہ دانشوری کا" کے عنوان سے ہے۔ پورا مضمون اس مصرعہ کے دوسرے حصہ کی توضیح ہے کہ "جو علم و ہنر کا ہے سب کچھ اسی کا" علمی اور بے علمی برابر کیسے ہوسکتے

ہیں؟ دانش والوں سے خالق دانش کا سوال خدا جانے کتنے جوابوں کا طالب ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک علم ہی سے عقل کی اصلاح ہوتی ہے ورنہ عقل کے بے لگام ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ ایک موضوع اسلامیات کا ہے جس میں طہارت، سجدۂ تحیت تصوف اور فتح مکہ کے عنوانوں اور مختلف حوالوں سے گفتگو ہے۔ اقبالیات کے تحت علامہ اقبال کی احمدیت اور ان کے چند محل نظر افکار و نظریات پر اظہار خیال ہے۔ اقبال کی راسخ العقیدگی کا اقرار کرتے ہوئے انہوں نے بعض لوگوں کے اس اصرار کو ستم ظریفی سے تعبیر کیا ہے کہ اقبال قادیانی تھے۔ اس بحث کو انہوں نے گہرے مطالعہ کے بعد پیش کیا ہے اور کہنا چاہیے کہ یہ مضمون اس باب میں قول فیصل ہے۔ علامہ کے بعض خیالات مثلاً اسٹالن مسلمان تھا یا یہ کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو انسان نے نہیں سمجھا یا یہ کہ اسلام ایک نظام مدنیت کی حیثیت سے مکمل طور پر ابھی سامنے نہیں آیا یا یہ کہ حیات عبارت ہے ایک سیاسی اور اجتماعی ہیئت سے نہ کہ محض مذہبی، اخلاقی نظام سے یا حضرت نظام الدین اولیاؒ سے اس درجہ اظہار عقیدت کہ

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

فاضل مصنف کے نزدیک یہ وہ چند مقامات اقبال ہیں جو ان کے نزدیک محل نظر ہیں لیکن اس کے اظہار یا ردو ابطال میں ان کے قلم کی نوک میں کہیں نیش و نشتر کا اثر نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بعض اقوال و احساسات کو انہوں نے بطور شواہد استعمال کر کے احتیاط کی مثال بھی پیش کردی، ایک اور تحریر مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے نظریہ قومیت و وطنیت پر ہے اور یہ مولانا مدنی سے ان کی غایت درجہ عقیدت کی بھی مظہر ہے۔ حسرت موہانی والے مضمون میں انہوں نے مجنوں گورکھپوری کے سہارے اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ حسرت کے کچھ سطحی اشعار پر تنقید کی بنیاد رکھنا، تنقید کا چھچھورا پن ہے۔ ہمارے لیے زیادہ دلکش حصہ شخصیات کا ہے جس میں پروفیسر مختارالدین آرزو، پروفیسر نذیر احمد، مولانا علی میاں اور قاضی مجاہدالاسلام کی زندگی کی کچھ جھلکیاں، دل و دماغ کو نور کے سرور کا لطف عطا کرتی ہیں، نثار احمد فاروقی والا مضمون بھی اس حصہ میں شامل ہوتا تو بہتر ہوتا۔ ایک مضمون جناب عطا عابدی کے مجموعہ کلام ''بیاض'' پر ہے۔ مصنف نے اس مجموعہ کا نام نقوش افکار رکھا ہے لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ گل افشانی گفتار بھی بے محل نام نہ ہوتا، تعارفی تحریروں میں سید حسن عباس کا پیش نامہ بھی خوب ہے۔ کاش فاضل مصنف کے ممدوح خاص پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کے ریاض قلم

کی کچھ تراوشیں بھی ہوتیں تو ریاض اور ریاضی کی معنویت اور نکھر جاتی۔

نکات سخن حسرت موہانی: تدوین و تنقید ذکیہ رخشندہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۸۴، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: دلکشا، این۔۴۹، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

کتاب کا تعارف پروفیسر وہاج الدین علوی کے قلم سے ہے اور اس کا اور کتاب کا آغاز حرف و لفظ شبلی سے ہے کہ انھوں نے حسرت کو جنات کا لقب دیا تھا۔ حالانکہ وہ بشر ہی تھے اور رہے۔ اس اجمال کی تفصیل حسرت کے محققین کے ہاں خوب ملتی ہے، شاعر حسرت کی غزل گوئی ان ہی کے الفاظ میں جان عاشقاں تھی، وہ جان جو ملک کی آزادی کے لیے وقف تھی اور عین اسی طرح وہ غزل کی عظمتوں کے احیاء کے لیے بھی مصروف کارو پیکار تھی، اب اس کی وجہ ان کی طرفہ طبیعت یا وہ مزاج تھا جو آبرو کی حفاظت ہی کے لیے ودیعت ہوا تھا۔ انھوں نے غزل کی حرمت، غزل ہی کے سہارے قائم کی لیکن اس سے بھی طبیعت سیر نہ ہوئی تو ان آداب سے بھی روشناس کرانے کی سعی بلیغ کی جن سے ادب کی تہذیب اور نہایت پرثروت روایت زندہ و تابندہ رہی ہے۔ نکات سخن نامی کتاب میں انھوں نے سخن کے متروکات، معائب، محاسن اور نوادر کے عنوانوں سے اعلیٰ وارفع شاعری کے لیے مطلوب ہدایتوں کو پیش کردیا، کبھی نکات سخن کی ارزانی رہی ہوگی، لیکن تغیر پذیر مزاج و مذاق نے جہاں اور مشرقی اقدار سے پہلو تہی کی وہیں علم و ادب کے اہم سرچشموں سے بھی دوری کا ماحول بنادیا۔ صحیح کہا گیا کہ اب نکات سخن گویا جنس نایاب ہے۔ ایسے میں اس کتاب کی جانب توجہ اور اس کے اہم حصوں کا بغور مطالعہ اور پھر اس کا تجزیہ یقیناً تحقیقی صراط مستقیم کی لائق شکر توفیق ہے اور یہ بجا طور پر ایک علمی خانوادہ کی حوصلہ مند خاتون کو ارزاں ہوئی، جنھوں نے نکات سخن کے دو زیادہ مفید حصوں یعنی معائب سخن اور نوادر سخن کی تنقید و تدوین پر توجہ دی۔ اس طرح فن شاعری سے شغف رکھنے والوں اور زبان و بیان کی اصلاح کا خیال رکھنے والوں کے لیے انھوں نے گویا ایک تحفہ پیش کردیا۔ اب کتنے شاعر ہیں جو تنافر، تکرار الفاظ، تعقید لفظی، شتر گربہ، ضلع جگت، ایہام و اشکال، ایطائے جلی، غلط العوام، حشو و زوائد جیسی فنی باریکیوں سے واقف اور ان کے مزاج داں ہیں۔ اسی طرح فعل لازم کے ساتھ "نے" کا استعمال، علاوہ اور بجز اور میرے اور اپنے، کون بجائے کس کے فرق سے واقف ہیں۔ قابل قدر شاعری کے لیے تخیل کی بلندی کے ساتھ قواعد کی پابندی

بہر حال ضروری ہے۔اس کتاب سے یہ بھولا سبق پھر تازہ و زندہ ہوگیا۔حسرت کے بعض خیالات اور اشعار اور ان کے تنقیدی رویے پر مصنفہ نے جس طرح وضاحتیں کی ہیں وہ بھی داد کے لائق ہیں،اس کے لیے انہوں نے دوسرے نقادوں کا بغور مطالعہ کیا۔اس طرح یہ کتاب محض طبع نو نہیں،طباعی نو کی اچھی مثال بن گئی۔اقبال کے ایک شعر کو معائب میں شامل کر کے حسرت نے ان کو اہل زبان کی فہرست سے خارج کر دیا تو مصنفہ نے بڑی معصومیت سے کہا کہ اگر حسرت کے اعتراض سے اتفاق بھی کر لیں تب بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی نہیں آئے گی،یہ حسن ذوق ہی نہیں حسن اعتراف بھی ہے۔اس نہایت مفید کتاب کی افادیت میں حسرت موہانی کی شخصی و علمی و ادبی زندگی پر مفصل مقدمہ سے اضافہ ہوا ہے،اضافہ تو ڈاکٹر وہاج الدین اور ڈاکٹر احمد محفوظ کی تحریروں سے بھی ہوا ہے۔اس کتاب کی قدر کی جانی چاہیے،خصوصاً طبقہ شعراء کو اس سے فائدہ اٹھانا ہی چاہیے۔

بضاعتی: از ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ازہری ندوی،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد،صفحات ۱۱۲، قیمت:۱۰۰/روپے، پتہ: مکتبہ دین و دانش، ۱۳۔مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔۱۔

وسط ہند کے شہر بھوپال کی تاریخ،ایک افغان حوصلہ مند دوست محمد خاں کی آمد اور پھر ایک مثالی حکومت کے قیام کی تاریخ ہے۔شجاعت،عدالت اور علم پروری اس تاریخ کے نمایاں ابواب ہیں۔وہاں کے کئی علمی و مذہبی خاندانوں میں وہ خانوادہ بھی شامل ہے جس کے گل سرسبد مولانا محمد عمران خاں ندوی ہوئے۔زیر نظر مختصر لیکن بہت دلچسپ کتاب مولانا مرحوم کے برادر زادہ اور خویش کے قلم سے ہے، جنہوں نے اپنی زندگی کی چند لیکن اہم یادوں کو یہ کہہ کر سمیٹا ہے کہ یہی ان کا لیکھا جوکھا اور کتھا ہے۔ عنوان خالص عربی میں اور توضیح مانوس ہندی میں،اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گل افشانی گفتار کا عالم کیا ہوگا،وہ عالم سے دانشور اور پروفیسر ہوئے۔ندوہ،قاہرہ،ازہر،عین شمس،لندن اور پھر مسلم یونیورسٹی ان کی زندگانی کے سفر کے اہم موڑ بنے۔قطرہ گہر بنتا رہا اور اس پر جو گزرتی رہی،اس کا حساب اتنا آسان نہیں لیکن اپنے مزاج کے مطابق انہوں نے ساری کتھا ایک سانس میں سنا دی اور اس طرح کہ سننے والے کی آنکھ،جھپکنا بھول جائے۔ندوے میں داخل ہوئے تو ندوہ کی فکر و مقاصد اور اس میں علامہ شبلی کی بنیادی اہمیت پر تبادلۂ خیال کرنا،ایک نووارد طالب علم کی ذہنی ساخت کی نشان دہی کرتا ہے۔اور جب

یہی ساخت اپنی انتہا کو پہنچی تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ عجیب وغریب سرزمین ہے، وہاں جیسا خمیر ہوگا ویسا ہی مال تیار ہوگا، نیک فطرت اولیاء اللہ اور بدسرشت شیطان کے کان کاٹنے والے وہیں ملیں گے اور یہ کہ علی گڑھ مسلمانوں کے لیے دور سے محبت وعقیدت کی جگہ ہے۔ ملازمت، سکونت کے لیے یوں مناسب نہیں کہ محبت وعقیدت خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ اسی سے اس متاع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو ہندوستانی فضا میں بضاعتی کے نعرہ کی ندرت کا لطف دیتی ہے۔ اس میں بزرگوں کے خطوط ہیں اور کچھ تصویریں بھی اور فاضل مصنف کی تحریروں کا اشاریہ اور شماریہ بھی، اور سب سے بڑھ کر لطف ولذت بھی۔

فردوس تغزل: از جناب ابوالبیان حماد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۳۸۰، قیمت: ۲۲۵/روپے، پتہ: ایس آر خالد، کیر آف ڈینٹل کیر، 2ND MAIN 82/4، تکاسندرا، بنگلور۔۳۰، دعوہ بک سنٹر، نمبر۴، تھرڈ اسٹریٹ، چارمینار مسجد روڈ کراس، شیواجی نگر، بنگلور۔۵۱، اور مصنف کا پتہ: دارالسلام، عمرآباد، ٹامل ناڈو۔

پاکیزہ، روح پرور اور بامعنی وبامقصد شاعری کی بات جب بھی ہوگی، جناب ابوالبیان حماد کا ذکر اس میں ہوکر رہے گا۔ وہ قادرالکلام، پختہ مشق اور پرگو شاعر ہیں۔ پہلے بھی حمد ونعت اور ملی واخلاقی مضامین پر مشتمل ان کے دو مجموعے، نغمات حمد ونعت اور بانگ حرا کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ غزل سے کس شاعر کو رستگاری ہے، چنانچہ اب باری اسی صنف لطیف کی تھی۔ قریب ڈھائی سو غزلیں تیار ہوئیں اور متاع درد کی کمیت وکیفیت میں اضافہ کرگئیں۔ شاعر نے اپنی شاعری کے تعارف میں کئی بار کہا کہ ع خون جگر بھی ان میں شامل ذرا ہوا ہے

ہیں جھلکیاں جس میں درد وغم کی ابوالبیان کی وہ شاعری ہے
سازِ سوز وگداز پر حماد نغمہ درد وغم سناتا ہے

صاف ظاہر ہے غم جاناں اور غم دوراں دونوں کو غزل کے حوالہ کردیا گیا اور زبان غزل ہی سے بتادیا گیا کہ

دلِ مضطر، ہجوم غم میں بھی ذکر حق سے سکون پاتا ہے
ان کی نگاہ ناز کا سارا قصور تھا لیکن ہمارے سر ہی وہ الزام دھر گئے
ہر بوالہوس کے بس کا نہ تھا یہ معاملہ ان کی گلی میں جان پہ ہم کھیل کر گئے

فردوس تغزل واقعی اسم بامسمّٰی ہے۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

پروفیسر محمد سمیع اللہ اسدؔ۔اظہار و آثار: ڈاکٹر احمد سجاد، عرفان پبلی کیشنز، ۲/۲۷ سالٹ لیک سٹی، کولکاتا۔۶۴۔ قیمت=/۱۵۰روپے

تحریر ”بے عدیل“ (قاضی محمد عدیل عباسی): ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، دینی تعلیمی کونسل، اترپردیش۔ قیمت=/۱۲۰۰روپے

تصوف اور بھکتی، تنقیدی اور تقابلی مطالعہ: شمیم طارق، ایم آر پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت=/۲۷۵روپے

جہان غزل: علیم صبا نویدی، ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنئی۔ قیمت=/۳۰۰روپے

رجال العرب و الهند: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، مرکز البحوث الاسلامیہ، گلشن عتیق نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ، بہار۔ قیمت=/۲۵۰روپے

سائبانِ رحمت (نعتیہ شعری مجموعہ): ساگر ترپاٹھی، 1/25، پشاورو ہار قلابہ، ممبئی۔ قیمت ہدیہ اعزازی

شاخ بے ثمر: عارف اعظمی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ (دہلی، ممبئی)۔ قیمت=/۲۰۰روپے

کامیابی کی قرآنی علامتیں: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، مرکز ثقافت و تحقیق علی گڑھ۔ قیمت=/۷۰روپے

کلیات رہبر: ڈاکٹر ارشد اعظمی، ادبی دائرہ، غلامی کا پورہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت=/۲۵۰روپے

مشاہیر، خطوط کے حوالے سے: ڈاکٹر رؤف خیر، امرین بک ایجنسی، ۸۷ بلاک، ۷ میونسپل کوارٹرس، کانچ کی مسجد کے پاس، جمال پور، احمد آباد۔ قیمت=/۲۰۰روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	″	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	″	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	″	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	″	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	″	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	″	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	″	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی		80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی		45/-
مکاتیب شبلی اول	″	150/-
مکاتیب شبلی دوم	″	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی		220/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
July 2017 Vol - 200 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-